Page 723

منتخب مضامین اردو

مرتبہ

ڈاکٹر سیّد رفیق حسین صاحب رفیق
ایم۔ اے۔ بی۔ اے (آنرز) ڈی۔ فل
لکچرار اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی
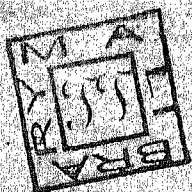
پبلشر
لالہ رام نرائن لعل بکسیلر
الہ آباد
۱۹۴۹ء
قیمت دو روپیہ

منتخب مضامین اردو

مرتبہ

ڈاکٹر سید رفیق حسین صاحب رفیق
ایم۔اے۔ بی۔اے (آنرز) ڈی۔فل
لکچرر اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی

پبلشرز
لالہ رام نرائن لعل بکسیلر
الہ آباد
سنہ 19[illegible]ء

[illegible] بار

قیمت دو روپیہ

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام رمضان علی شاہ چھپی

دیباچہ

دنیائے ادب میں مختصر مضمون نگاری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جو بعض حیثیتوں سے بہت زیادہ وقیع ہے ۔ زبان اور ادب کی تشکیل اور ابتدا تو اس کے بغیر بھی ممکن ہے اور قریب قریب دنیا کی ہر زبان کی بنیاد اس کے بغیر ہی پڑی ہے لیکن جب تک مختصر مضمون نگاری کی ابتدا نہیں ہوئی اُس وقت تک اُس زبان اور ادب کی ترقی و توسیع نہیں ہوئی اور نہ اُس میں جامعیت و افادیت آئی۔ معاشرت انسانی کی ترقی و ترویج میں جملہ علوم و فنون کی معاونت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو سکتا ہے اور جب تک ایسا نہیں ہوتا ہماری زندگی میں ایک قسم کی خامی پائی جاتی ہے مختصر مضمون نگاری اس غرض و غایت کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرتی ہے ۔ شاعری یا دوسرے فنون لطیفہ اس غرض و غایت کو باحسن وجوہ پورا نہیں کرتے ۔ ان سے مسرت و سکون اور فرحت و انبساط اور نہ جانے کیا کیا حاصل ہوتا ہے ۔ بعض اہم اور پیچیدہ مسائل حیات پر روشنی بھی پڑ جاتی ہے لیکن ان سے یہ امید رکھنا کہ زندگی کے ہر شعبہ پر یہ چھا جائیں تحصیل حاصل ہے ۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ

نہیں ہوتا (حالانکہ یہ بھی طبیعت پر بار گراں ہوتی ہیں) لیکن اگر اس میں بہت زیادتی ہوئی تو مضمون نگار کی قابلیت پر آنچ آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اچھے مختصر مضامین بہت سیدھی سادی طرزِ ادا میں لکھے جاتے ہیں۔ زبان صاف ستھری با محاورہ اور سلیس ہوتی ہے۔ عبارت گنجلک نہیں ہوتی اور نہ بیان میں اُلجھاؤ ہوتا ہے۔ عجیب وغریب استعارے اور تشبیہ کی بھرمار نہیں ہوتی۔ تسلسل بیان اور خیالات کی صفائی سے مضمون میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ خیالی باتوں سے زیادہ حقیقت نگاری پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔

اُردو میں مختصر مضمون نگاری کا رواج بہت دیر میں ہوا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اُردو میں رسائل واخبار ذرا دیر میں جاری ہوئے۔ مختصر مضامین کی ترقی وترویج کا انحصار انھیں پر ہوتا ہے۔ اگر شروع کے تمام اخبار ورسائل مل جائیں (جس کی بہت کم اُمید ہے) تو اس کا پتہ چلانا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ ابتدائی دور کے ممتاز مضمون نگار کون کون ادیب تھے۔ اولیت کا سہرا کسی ایک شخص کے سر باندھنا ذرا مشکل کام ہوگا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار مولوی باقر علی نے (شاید) سب سے پہلے اُردو اخبار دہلی سے نکالا تھا لیکن اس کی جلدیں نایاب ہیں اس لئے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اُردو ادب کا جو کچھ ذخیرہ ہمارے سامنے ہے اُس کو دیکھنے سے یہی

پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے آزاد ہی نے مختصر مضامین کی طرف توجہ کی۔ انگریزی کے ممتاز و مایۂ ناز مضمون نگاروں کے بعض بلند پایہ مضامین کا آزاد ترجمہ نیرنگ خیال میں پایا جاتا ہے۔ اور کچھ نئے اور اچھوتے مضامین بھی مولانا آزاد نے لکھے مثلاً شہرت عام و بقائے دوام کا دربار جسے ہندوستانی تہذیب و تمدن کا تاریخی پس منظر سمجھنا چاہیئے۔ آزاد کے علاوہ اُن کے ہی زمانہ میں اُردو کے سب اچھے اور مایہ ناز مضمون نگار دنیائے ادب میں جلوہ پیرا ہوئے۔ اس کا شرف سرسیّد کی ذات والاصفات کو حاصل ہے۔ آزاد نے جو کچھ اُردو کی خدمت کی وہ انفرادی حیثیت سے کی لیکن سرسیّد نے خود بھی مضامین لکھے اور بہت سے رفیق کار بھی پیدا کیے جن کی بدولت اردو آج اردو ہے۔ تہذیب الاخلاق جاری ہونے سے پہلے اُردو نثر میں قصّے، کہانی، افسانے اور فقہی و مذہبی مسائل کے علاوہ خالص علمی، تنقیدی، تاریخی، سیاسی اور فلسفیانہ مضامین کی بہت کمی تھی۔ زبان کی تکمیل تو شعراء نے کر دی تھی لیکن ادب کی تکمیل و معراج سرسیّد اور اُن کے رفقائے کار حالی، شبلی۔ نذیر احمد۔ محسن الملک۔ ذکاء اللہ وغیرہم اور دیگر بلند پایہ مضمون نگاروں کے ہاتھوں ہوئی۔ اِن بزرگوں پر اُردو جتنا ناز کرے کم ہے۔

اِس مجموعہ کے انتخاب کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اُردو کی بعض کتابیں جو بی۔ اے کے نصاب میں داخل ہیں وہ اب کمیاب ہو گئی ہیں۔

ان کے حاصل کرنے میں طلباء کو بڑی کافی دشواری ہوتی ہے۔ محترمی
پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی
کے ارشاد عالی کی تعمیل میں یہ انتخاب پیش کیا گیا جو اب الہ آباد یونیورسٹی
کے نصاب میں شامل ہے۔ اس میں اردو کے بلند پایہ مضمون
نگاروں کے مضامین ہیں۔ پرانے اور نئے صاحبان طرز ہیں۔
جن سے طلباء کو واقف رہنا چاہیئے۔ اس میں تنقیدی۔ ادبی۔
تاریخی اور تمدنی مضامین ہیں جن سے طلباء میں مذاق سلیم پیدا ہونے
کی کافی امید ہے۔ بہت سے نئے الفاظ و محاورات اور ان کا
صحیح استعمال معلوم ہوگا اور اگر توجہ اور کافی مشق سے کام لیا
گیا تو کچھ طلباء ضرور اچھے مضمون نگار بن سکتے ہیں۔ اس طور سے
اردو اور اردو والے حضرات کی خدمت کرنے کا ان مضامین کو
پیش نظر کرنا چاہیئے۔

رفیق حسین
۱۰ فروری سنہ ۱۹۴۹ء

یونیورسٹی الہ آباد

فہرست مضامین

تعصّب

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کر دیتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے۔ تو اس کے فائدے اور نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے۔ مگر صرف تعصب سے اُسے اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

(مذہبی تعصبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے
مگر اوّل امور تمدّن و معاشرت میں جو نقصان تعصّب سے پیدا ہوتے ہیں
اُن کا ذکر کرتے ہیں)۔

انسان قواعد کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ وہ تنہا اپنی حوائج
ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی
جو دوستی اور محبّت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے مگر متعصّب
بسبب اپنے تعصّب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے۔
اور کسی کی دوستی اور محبّت کی طرف بجز اُن چند لوگوں کے جو اُس کے
ہم رائے ہیں۔ مائل نہیں ہوتا۔ عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا یہ معلوم
ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ آرام اور زیادہ
لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں۔ اُن کو انسان اختیار کرے۔ مگر متعصب
ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر اور فن اور علم ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت
اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہئے مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک
ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں جو نئی تحقیقات سے اور نئے
علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں۔ محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔
اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور جو کچھ
اس میں سمائی ہوئی ہے۔ اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اُس میں
طاقت اور قوت نہیں رہتی، وہ ایک ایسے جانور کے مانند ہوتا ہے کہ جس
کو جو کچھ بالطبع آتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل

نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجے سے نہایت پست درجہ ذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجے سے ترقی کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئیں۔

مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم دکھلانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لئے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجے کی عزت تک پہنچیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ پڑی ہے کہ بعضی دفعہ ایک غلط نمائشی کے جذبے سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو اور تمام شخصوں کو جو اس مذہب کے نہیں ہیں اور تمام اُن علوم و فنون کو جو اس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں، نہایت حقارت سے دیکھے اور بُرا سمجھے اس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے اور بڑا پختہ اور پکّا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ

عمدہ چیزیں ہیں۔ پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے
سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ اُن دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی
میں سستی آتی ہے کیونکہ مذہبی مسائل اِن دنیاوی علوم کے پڑھنے سے
مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان
اپنے ایسے روشن اور مستحکم اور سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے
ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اُس کی رہی کا خیال کرتے ہیں نعوذباللہ
منہا۔ مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جائیگی
اُسی قدر اُس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔ اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے
مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی
اہل مذہب کے لئے ہوسکتی ہے۔ تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو
نہایت بُرا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے
مذہب کا ہوتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے۔ اُس کے اُصول
کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے، مخالفوں اور معترضوں اور بُرا کہنے
والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور خود بھی اُس کے دفعیہ پر
مستعد ہوتا ہے اور اور لوگوں کو بھی اُس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔
وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے، پہلی بسم اللہ
ایسی بدخصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل
ہے اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اُس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے۔

اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے بدلے اُلٹا اس کا ہارج قوی ہوتا ہے۔ اپنے تعصب کے سبب بداخلاق اور مغرور اور سنگدل سخت دل ہو جاتا ہے اور ٹھیک ٹھیک اس آیت کریمہ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ سے مخالفت صریح کرتا ہے۔

مذہب میں متعصب شخص دوسرے کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا اور اس بات سے ضمناً وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کے اور بلا جواب دیئے باقی رہ جاویں وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے پس یہ تمام باتیں مذہب کی درستی کی نہیں بلکہ مخالفوں کی فتحیابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرض کہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں نہایت بُرا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

مغرور و متکبر ہو جانا اور اپنے ہمجنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔

اُس کے اصول کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو۔ مگر ایسا نہیں کر سکتا اور بہ مجبوری ہر ایک سے ملتا ہے اور اُوپری دل سے اُن کا ادب اور اپنی جھوٹی نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے اور ایسا کرنے سے ایک اور بدخصلت نفاق اور کذب اور دغابازی اور فریب و مکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جس نے خود ہی تمام کمالات تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا ہے، مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔

علم میں اس کو ترقی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں، بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی، ہنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دنیا کے واقعات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم رہتا ہے۔ حصول معاش اور دنیاوی عزت اور تمول مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل و خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔

اسکی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور بھی کیا کر رہے ہیں۔ بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے۔ پپیہا کیا پی رہا ہے اور مکھی کیا چن رہی ہے۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے۔ نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال اس میں نہیں آتا۔ تربیت و شائستگی، تہذیب انسانیت

کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا اور جب کہ وہ مذہبی غلط نمائی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سم قاتل ہوتا ہے کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب و برباد کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا داؤ تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتے کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچائی کو پسند کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کا بھید جانتا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا اور تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہیے۔ تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم کو پیروی کرنا چاہیے۔

مزاح

مزاح جس کو غلطی سے مذاق کہنے لگے ہیں انسان کی ایک جبلی خاصیت ہے جو کم و بیش تمام افراد میں پائی جاتی ہے۔

مزاح کو عربی، فارسی اور اردو میں تین مختلف القاب دیے گئے ہیں یعنی۔

۱۔ مطائبہ۔

۲۔ خوش منشی۔
۳۔ خوش طبعی۔

یہ تینوں لقب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مزاح کا موضوع "خوشی" کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ روزانہ محنت و مشقت جو ہر انسان کا فرض ہے۔ اس کے بعد ہر شخص ایسے مشغلے ڈھونڈتا ہے جن سے تھوڑی دیر دل بہلے اور دن بھر کی کوفت رفع ہو اور ایسے اوقات میں کوئی مشغلہ مزاح سے بہتر نہیں ہے۔

ہم اپنی زبان میں مزاح کا ترجمہ ہنسی، چہل، دل لگی، ٹھٹھول وغیرہ کر سکتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ اب ہماری زبان میں یہ الفاظ صرف مزاح کے مترادف نہیں رہے بلکہ چھچھورپن۔ شہد پن، مسخر گی، فحش۔ دشنام، بیحیائی دھول دھپا۔ جوتی پیزار بھی شامل ہیں

مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لئے (نہ کہ کسی کا دل دکھانے کے لئے) کیا جائے، ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا یا ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے۔ جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفہ و حکما بلکہ اولیا و انبیا نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہوتا ہے

برخلاف اس کے جب وہ اس حد سے بڑھنے لگتا ہے تو مذموم ہولناک ہوتا جاتا ہے اور آخر کو اس سے بجائے محبت کے دشمنی اور بجائے خوشی کے غم ہو جاتا ہے۔ وہ اخلاق کو اس طرح بگاڑتا ہے۔

جیسے لوہے کو زنگ یا لکڑی کو گھن ۔ مزاح کرنے والا ایسا بے دیدہ ہوجاتا ہے کہ غیروں کو ہنسانے کے لئے اپنے عزیز دوست کا خاکہ اڑانے لگتا ہے ۔ وہ ایسا بیباک ہوجاتا ہے کہ خدا اور رسول پر بھی اُس کی ایک آدھ پھبتی ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ ایسا کذاب ہوجاتا ہے کہ بُری خبریں جن کو سُن کر خاص یا عام لوگوں کو رنج ہو نہایت خوشی سے اڑاتا ہے ۔ وہ ایسا بے غیرت ہوجاتا ہے کہ اُس کو سخت سے سخت گالی بھی ناگوار نہیں گزرتی وہ ایسا مفسد ہوجاتا ہے کہ باتوں باتوں میں لڑائی کرا دینی اُس کے نزدیک ایک کھیل اور معمولی بات ہوتی ہے ۔ غرض تمام دنیا کے عیب مزاح کی زیادتی سے انسان میں پیدا ہوجاتے ہیں ۔

مزاح کے بڑھنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں مگر ہم یہاں وہ خاص سبب بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے مزاح کسی خاص قوم میں رفتہ رفتہ تمسخر اور استہزا بلکہ فحش و دشنام کے درجہ کو پہنچ کر انسانی خصلت سے ایک قومی خصلت بن جاتا ہے اور اس قدر عام ہوجاتا ہے کہ اُس کی بُرائی اور عیب نظروں سے ساقط ہوجاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہنسی اور چہل میں جو امتیاز ہماری قوم کو حاصل ہے وہ تمام ہندوستان میں کسی قوم کو حاصل نہیں ہے ۔

جتنے ضلع جگت بولنے والے اور پھبتیاں کہنے والے پیدا ہوتے ہیں اسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں ۔

جتنی گالیاں ایک مسلمان شریف زادہ کو یاد ہوتی ہیں کسی کو نہیں ہوتیں ۔

تمام ہندوستان میں جتنے پنچ اخبار ہیں اُن کے ایڈیٹر

پروپرائٹر (مالک) اور کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) اسی قوم کے زنخہ دل طبع ہندوستانی امیروں اور امیرزادوں کی مجلس میں جتنے مسخرے اور رونق محفل پاؤ گے اسی قوم کے پاؤ گے۔

واعظوں میں جتنے لطیفہ گو اور بذلہ سنج دیکھو گے اسی قوم کے پاؤ گے۔

فحش اور بیحیائی کی کتابوں میں ایک بھی ایسی نہ ہو گی جس کا مصنف مسلمان نہ ہو گا۔

مناظرہ کی کتابیں اسی قوم کے عالموں کی ایسی نکلیں گی جن میں ستم ظریفی کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہو۔

شاعروں میں کوئی ہاجی، ہزل گو، ریختی گو اور گندہ دہن ایسا نہ ہوگا جو قوم کا مسلمان نہ ہو۔

داستان کہنے والوں میں صرف ایک شخص ایسا سنا گیا ہے جو اصل میں قوم کا مسلمان نہ تھا لیکن آخر اس کو بھی مسلمان ہونا پڑا۔

الغرض اس قوم کی فصاحت۔ ذہانت اور فضیلت جس قدر مزاح میں صرف ہوتی ہے ویسی کسی اور کام میں نہیں ہوتی۔

یہاں نہایت تعجب کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمینہ خصلت اسی قوم کے حصہ میں کیوں آئی ہے؟ شاید اس کا یہ جواب دیا جائے کہ تنزل کے زمانے میں ہر ایک قوم کے فضائل رذائل سے ساتھ بدل جاتے ہیں اور تمام کمینہ خصلتیں اور سفلہ عادتیں خاص اور عام میں خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں لیکن غور کرنے کے بعد یہ جواب کافی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابھی یہ بات غیر منفصل ہے کہ قومی تنزل اخلاق کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے یا اخلاق کا بگڑنا قومی تنزل کا

باعث ہوتا ہے۔ پس وہی سوال اب بھی باقی رہتا ہے۔

البتہ ایک اور جواب ہمارے خیال میں آتا ہے۔ جو غور کے قابل ہے۔ ادنیٰ توجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاح کو جس قدر تعلق زبان اور الفاظ سے ہے۔ ایسا اور کسی چیز سے نہیں۔ خاص خاص صورتوں کے سوا ہمیشہ ہنسی اور ٹھیل الفاظ ہی کے پیرایہ میں کی جاتی ہے۔

اُس زمانے میں جب کہ انسان کی اخلاقی تعلیم طفولیت کی حالت میں تھی اور اُس کی منہ تہ ذری اور بدلگامی کا چنداں انسداد نہ ہوا تھا۔ ضرور ہے کہ مزاح اور ظرافت نے اُن قوموں میں زیادہ رواج پایا ہوگا جن کی زبان میں اُس کی زیادہ قابلیت تھی۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب کی زبان اُس وقت کی تمام زبانوں کی نسبت اس بات کی زیادہ قابلیت رکھتی تھی۔ اُس میں ایسے الفاظ کثرت سے تھے جو دو معنی رکھتے ہوں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے مولیٰ کہ آقا اور غلام دونوں کو کہتے ہیں۔

اُس میں ایسے الفاظ بھی بکثرت تھے جو بہت سے مختلف معنوں کے لئے وضع کئے گئے ہوں جیسے عین کہ آنکھ چشمہ ذات اور سونے کو کہتے ہیں۔

اُس میں مترادف الفاظ بھی بے شمار تھے یعنی ایک ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ مستعمل ہوتے تھے جیسے اسد، لیث، غضنفر وغیرہ۔

اس وقت عرب میں شاعری کا زور بھی اس قدر تھا کہ دنیا کی کسی زبان میں نہ تھا اور اس سبب سے مجاز۔ کنایہ اور استعارہ کا وہ حال

سب جگہ سے زیادہ برتاؤ تھا۔

یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں ایسی ہیں جو اہل زبان کو مزاح کی طرف خود بخود مائل کرتی ہیں۔ کیونکہ مزاح میں زیادہ تر ایسے ہی لفظوں کا استعمال ہوتا ہے۔

مزاح میں جو خوشی متکلم اور مخاطب کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک طبعی بات ہے۔ پس اگر اُس کی مزاحمت نہ کی جائے تو ضرور رفتہ رفتہ وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے اور تمسخر و استہزا بلکہ فحش و دشنام تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

عرب کا بھی ایسا ہی حال ہوا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین کو مبعوث فرمایا اُس وقت یہ ذمیم خصلت اُن میں حد سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ اُن کے ہاں سب و شتم و قذف کا کچھ عیب نہ تھا۔ اُن کے مردم ردوں سے اور عورتیں عورتوں سے تمسخر و استہزا کرتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو بُرے ناموں اور بُرے القاب سے یاد کرتے تھے۔ اُن کے اشعار میں ہجو اور فحش کثرت سے ہوتا تھا۔ چنانچہ بہت سی آیتیں قرآن میں اور بہت سی حدیثیں صحاح میں ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مزاح سخریت استہزار، سب، لعن، قذف فحش، نبارت، لمز اور تنابز بالالقاب اُن کے ہاں شدت کے ساتھ رائج تھا۔

آنحضرت کی پاک تعلیم سے جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا چند روز میں یہ تمام برائیاں نیست و نابود ہو گئیں اور صرف اس قدر مزاح باقی رہ گیا جو سوسائٹی کے لئے باعث زینت ہے۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی یہی حال رہا بلکہ جو لوگ

صاحب ہیبت و وقار تھے وہ اس پسندیدہ مزاح کو بھی پسند نہ کرتے
تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمر فاروق رضؓ کے سامنے چند صحابہ کے نام
لئے گئے جو اس وقت خلافت کے لائق سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے
ہر ایک کی نسبت کچھ کچھ اعتراض کئے اور حضرت علی کے نام پر صرف
یہ کہا کہ ھو رجل کثیر الدعابۃ یعنی اُن کے مزاج میں مزاح بہت
ہے۔

خلافت راشدہ کا زمانہ گزر گیا اور اسلام میں شخصی سلطنت کی
بنیاد پڑی اور وہ وقت آیا جس کی نسبت مخبر صادق نے ثم یصیر
ملکاً عضوضاً کہا تھا تو تمام طبقات انام کو ایک خاص شخص کی مرضی اور
رائے کا تابع ہونا پڑا۔ فقیہوں نے خلفار کے جذبات نفسانی پورے
کرنے کے لئے شرعی حیلے تراشنے شروع کئے۔ شعرا کو فاسق و فاجر بادشاہو
کی مدح میں قصائد غرا انشا کرنے پڑے۔ مشیر اور ندیم بجائے مشورہ
اور اصلاح نیک کے لطائف و مضحکات سے اُن کے دل لبھانے لگے
چونکہ مزاح اور ظرافت عرب کے خمیر میں تھی۔ گو وہ نبی برحق کی تعلیم
سے ایک مدت تک اس کو بھولے رہے۔ لیکن جب زمانے کی حالت
خود اُس کی محرک ہوئی تو پھر اپنی اصلی خاصیت پہ آ گئے۔ تاہم بنی امیہ
کے عہد میں بہ سبب قرب عہد رسالت کے مزاح اور ظرافت محدود رہی
بنی عباسیہ کے زمانے میں مزاح نے خوب رونق پائی۔ ندیم
مصاحبوں کی جماعت بھی سامان عیش و نشاط کا ایک جزو اعظم قرار
پائی۔ بغیر اُن کے شبستان خلافت سونا سمجھا جاتا تھا۔ سفر اور حضر میں احتیاجاً
اور ندیم خلیفہ کے ہمراہ رہتے تھے۔ پھر جس قدر اُن کی فتوحات بڑھتی

گئیں۔ یہ رنگ بھی اُن کے ساتھ بڑھتا گیا۔ مگر امویہ اور عباسیہ کے آخیر زمانے تک ظاہر انقش اور ہزل نے مسلمانوں میں چنداں رواج نہ پایا تھا۔

البتہ ایران میں جاکر بعض اسباب ایسے جمع ہوئے کہ مزاح حدِ اعتدال سے بہت بڑھ گیا۔[1] چنانچہ سعدی شیرازی کے مطائبات اور انوری وشفائی کے اہاجی اور سب سے زیادہ فارسی مصطلحات کی کتابیں اس کی

---

(۱) شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی۔ اعلیٰ پایہ کے شاعر۔ مدرسہ نظامیہ بغداد کے طالب علم۔ ابن جوزی کے شاگرد اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ اپنی آنکھوں سے بڑے بڑے انقلابات دیکھے اور ان سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ بغداد انھیں کے سامنے تباہ ہوا۔ عمر کا بڑا حصہ ایشیا اور افریقہ کی سیاحت میں گزارا۔ پاپیادہ ۱۴ مرتبہ حج کئے۔ فارسی غزل کے پیمبر اور یورپ میں مشرق کے شیکسپیر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ گلستاں بوستاں کی تصنیف نے اُن کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ جن کے سینکڑوں ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ء) میں وفات پائی۔ (۲) شفائی شمس الدین حسین ابن حکیم ملا شفائی اصفہان کا رہنے والا تھا۔ تھوڑی سی عمر میں بہت سے علوم حاصل کر لئے اور فلسفے میں خاص دستگاہ رکھتا تھا۔ مدت تک طبابت کرتا رہا۔ چنانچہ اُس کی قرابادین اب تک مشہور ہے۔ شاہ عباس اس کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ ہجو گوئی اس کی طبیعت پر زیادہ غالب تھی۔ لیکن آخر عمر میں اس لغوگوئی سے توبہ کر لی تھی۔ اس کی وفات ماہ رمضان سنہ ۱۰۳۷ھ میں واقع ہوئی۔ تصنیفات میں سے مثنوی دیدہ بیدار۔ نمکدان حقیقت، مہر و محبت اور ایک دیوان موجود ہے۔

گواہ ہیں۔ وہاں ہنسی اور حیل اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اصحاب فضیلت اس کی مشق بہم پہنچاتے تھے۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے تقرب سلطانی حاصل کریں۔ وہاں فحش اور ہزل کا نام "مطائبہ" رکھا گیا تھا، چنانچہ "مطائبات سعدی" مشہور ہیں۔ وہاں لفظ ظرافت جس کے معنی عربی میں زیرکی اور دانائی کے ہیں۔ ہنسی اور حیل کے معنی میں مستعمل ہونے لگا تھا، جیسا کہ آج کل ہندوستان میں بھی مستعمل ہیں، یعنی وہی لوگ بڑے لائق و فائق سمجھے جاتے تھے جو ہنسی اور حیل میں کمال رکھتے تھے، یہی رنگ خیتائیہ کے عہد میں فارسی زبان کے ساتھ ایران سے ہندوستان میں آیا۔

اگرچہ اسلام کی سلطنت شخصیہ میں بھی بہت سے بادشاہ جن کو مہمات سے فرصت کم ملی یا جن کے مزاج میں قدرتی ہیبت اور وقار تھا نہایت سنجیدہ گذرے ہیں جن کے دربار میں کسی کو بیہودہ گوئی کی مجال نہ تھی۔ مگر اکثر اُن کے برخلاف تھے۔ خصوصاً وہ جن کا ملک کسی کئی پشت سے خارجی حملوں سے محفوظ تھا اور نہایت اطمینان کے ساتھ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے تھے۔

انسانی نسلوں کی قدیم سے یہ خاصیت رہی ہے کہ جن کو وہ دولت یا سلطنت وراثتاً بغیر سعی و کوشش کے ہاتھ لگی ہے اور بغیر کسی مزاحمت کے وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ انھوں نے کبھی اُس عطیۂ غیبی کی کچھ قدر نہیں کی۔ وہ اُس کی نگہداشت اور محافظت سے غافل ہو کر عیش و عشرت میں ایسے منہمک ہوئے کہ دنیا و ما فیہا کو فراموش کر دیا۔ جب وہ عیش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو اس میں کوئی نئی اختراع کرنی چاہتے ہیں اور جب اُس نئی اختراع سے بھی طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو

اُسے اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ اب اُن کی حالت چوپاؤں اور جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اور اُن کے تمام فضائل مبدل بہ رذائل ہو جاتے ہیں۔

اُن کی جرأت بے حیائی ہو جاتی ہے۔ ان کی سخاوت اسراف ہو جاتی ہے۔ اُن کی شجاعت بے رحمی ہو جاتی ہے، اُن کی اولوالعزمی بوالہوسی ہو جاتی ہے۔ اُن کے مذاق ایسے فاسد ہو جاتے ہیں کہ جو لذت روح کو پند و حکمت سے ہونی چاہیے وہی لذت اُن کو فحش اور ہزل سے ہو جاتی ہے۔

جب خود مختار بادشاہوں کی ایسی حالت ہو جاتی ہے تو ملک کے خاص و عام کو وہی روپ بھرنا پڑتا ہے جو اُن کے درخور مزاج ہو۔ خصوصاً وہ فرقہ جو مذہب و ملت کی رو سے بادشاہ کا ہم قوم ہوتا ہے۔ اور جس کو بہ نسبت اور قوموں کے تقرب اور حضوری کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ یا زیادہ امید ہوتی ہے۔ اُس کو درباداری اور مصاحبت کی وہ تمام لیاقتیں پورے اور اکمل طور پر حاصل کرنی پڑتی ہیں جو بادشاہ کے نزدیک لیاقتیں سمجھی جاتی ہیں۔

اگر بادشاہ کو گانے بجانے کا شوق ہے تو ہزاروں بھلے مانس گانا بجانا سیکھتے ہیں۔

اگر اُس کی طبیعت حسن پرستی اور ہوا و ہوس کی طرف مائل ہے تو ہزاروں اہل علم غزل، واسوخت اور مثنوی لکھنے میں کمال بہم پہنچاتے ہیں۔

اگر وہ خود پسند اور خوشامد پسند ہے تو شعرا کو بھاٹ بننا پڑتا ہے۔

اور قصیدہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل کرتا ہے۔
اگر اُس کو ہنسی اور چہل سے رغبت ہے تو ہزاروں سنجیدہ اور متین آدمی مسخرہ پن اختیار کرتے ہیں۔
یہی حال خاندان چغتائیہ[1] کے آخری دور میں ہوا۔
ہنسی اور ٹھٹھول کی چشم ید دور اوپر ہی سے بنیاد جمتی چلی آتی تھی۔
یہاں تک کہ عالمگیر[2] جیسے روکھے اور متشرع بادشاہ کے دربار میں بھی نعمت خاں عالی[3] جیسا ظریف اور بذلہ سنج موجود تھا۔

۱۔ خاندان چغتائیہ۔ اس خاندان نے ماوراء النہر، کاشغر، بلخ، بدخشاں، غزنی وغیرہ پر ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) سے (۷۷۱ھ (۱۳۷۰ء) تک ۱۴۷ سال حکومت کی اس خاندان کا بانی چنگیز خاں کا بیٹا چغتائی تھا۔

۲۔ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کے زبردست شہنشاہوں میں سے تھا۔ سلطنت مغلیہ کو جتنا عروج اُس کے وقت میں ہوا، اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور اُس کے بعد تو انحطاط شروع ہوگیا۔ نہایت دیندار متشرع سخت محنتی جفاکش۔ منتظم۔ منصف مزاج۔ عادل اور بارعب شہنشاہ تھا۔ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) تخت دہلی پر متمکن ہوا اور ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں انتقال کیا۔

۳۔ نعمت خاں۔ مرزا محمد نام۔ عالی تخلص اور نعمت خاں خطاب تھا۔ شیراز سے آکر عالمگیر کا داروغۂ مطبخ اور صرف خاص کا دیوان مقرر ہوا۔ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں وفات پائی۔ وقائع نعمت خاں عالی اس کی مشہور کتاب ہے۔

محمد شاہ[1] کے عہد میں ظرافت یہاں تک بڑھی کہ منجر بہ تمسخر و استہزا ہو گئی بادشاہ ملک کا انتظام اوروں پر چھوڑ کر آپ ہمہ تن عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا اور اس کو ناچ رنگ اور شراب و کباب کے سوا کوئی شغل نہ رہا۔ تمام اعیان سلطنت بادشاہ عہد کی طبیعت کا میلان دیکھ کر اسی رنگ میں رنگے گئے۔ امیروں میں باہم نوک جھونک ہونے لگی۔ مردوں میں نواب امیر خاں[2] اور عورتوں میں نور بائی[3] ایک ایک پر پھبتیاں کہتے تھے۔ یہاں تک کہ برہان الملک[4] اور آصف جاہ جیسے سنجیدہ آدمیوں پہ بھی

---

(۱) محمد شاہ خاندان مغلیہ کے دور انحطاط کے بدقسمت بادشاہوں میں سے تھا اسی کے عہد میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ ۱۷۱۵ء تخت پر بیٹھا اور ۱۷۴۸ء میں مر گیا۔

(۲) امیر خاں۔ عمدۃ الملک خطاب تھا اور محمد شاہ کے خاص الخاص مقربین میں سے تھا۔ الہ آباد کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد واپس بلا لیا گیا۔ کیونکہ بادشاہ اس کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ نہایت حاضر جواب اور بیباک تھا۔ اس کی بیباکی آخر رنگ لائی۔ جب بادشاہ کے حضور میں بھی بیباکی اور گستاخی سے پیش آنے لگا تو ایک روز ناخوش ہو کر بادشاہ نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اور اس نے ۲۶ دسمبر ۱۷۴۶ء کو ایک خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔

(۳) نور بائی۔ دربار محمد شاہ کی مشہور طوائف تھی۔ نادر شاہ اس کو اپنے ساتھ لیجانا چاہتا تھا۔ مگر قسمت تھی کہ بچ گئی۔

(۴) برہان الملک اصلی نام محمد امین عرف سعادت خاں تھا۔ خراسان (باقی)

اُن کے دار چلتے تھے اور اُن کو بھی کبھی کبھی اپنی وضع کے خلاف جواب دینا پڑتا تھا۔

یہ رنگ رفتہ رفتہ خاص و عام میں پھیل گیا اور تمام امراء کی مجلسوں میں مسخرہ پن ہونے لگا اور اس طرح محمد شاہ رنگیلے کی بدولت تمسخر اور استہزا اعلیٰ سے ادنیٰ تک تمام طبقوں میں پھیل گیا۔

پھر جب نواب سعادت علی خاں کے ساتھ دہلی کی زبان لکھنؤ میں گئی تو زبان کے ساتھ ہی ساتھ یہ رنگ بھی وہاں پہنچا اور لکھنؤ میں اُس نے اور بھی ترقی پائی۔ وہاں کے اکثر کارفرما ایسے ہوئے جو تعیش و کامرانی میں محمد شاہ پر بھی سبقت لے گئے۔ اُن کے ہاں بھی مسخرہ پن کا بازار خوب گرم رہا۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں ثانی[۱] جیسے مدبّر اور ہوشمند کو بھی

(بقیہ نوٹ) کے تاجروں میں سے تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آیا اور اودھ کی صوبہ داری پر فائز ہوا۔ ۱۷۳۹ء (۱۱۵۲ھ) میں وفات پائی۔ اودھ کے نواب اسی کی اولاد میں سے تھے۔

۵۔ آصف جاہ۔ فرمانروایانِ حیدرآباد کے مورثِ اعلیٰ اور دربارِ مغلیہ کے زبردست امراء میں سے تھے۔ محمد شاہ کے وقت میں حیدرآباد کے صوبیدار مقرر ہوئے اور ۳۰ برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ صوبہ دکن میں حکومت کی۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں وفات پائی۔

(۱) سعادت علی خاں ثانی۔ وزیر علی بن آصف الدولہ کے بعد ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو اودھ کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۷ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۱۴ء کو فوت ہو گیا۔

سید انشاء اللہ خاں بغیر چین نہ آتا تھا۔

چونکہ مزاج اور زبان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے لازم و ملزوم ہیں اور ظاہر ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کو زبان اردو کے لحاظ سے تمام ہندوستان پر ترجیح ہے۔ اس لئے یہ دونوں شہر ہنسی اور چہل کے لحاظ سے بھی اور شہروں سے بالاتر ہے۔

مذہب اور عقل

ہم کو اس کتاب میں اُن لوگوں کے ساتھ مناظرہ کرنا منظور نہیں مگر مگر تاہم اتنا تو خواہی نخواہی کہنا پڑتا ہے کہ بلاشبہ مبدار فیاض نے انسان کو ظاہری باطنی جتنی قوتیں دی ہیں، سب میں عقل بڑی زبردست ہے۔ اور وہی مدار تکلیف شرع بھی ہے لیکن بایں ہمہ نیست، کہ عقل بھی ایک قوت ہے اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے، اس سے باہر نہیں۔ پھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا خود متحرک ہو۔ مثلاً فرض کرو کہ کشتی یا ریل میں ہو تو وہ اُلٹا ٹھہری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے اور اپنے تئیں ٹھیرا ہوا یا تیز حرکت

---

(۱) سید انشاء اللہ خاں۔ میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے اعلیٰ درجے کے ظریف الطبع شاعر تھے۔ دریائے لطافت ان کی مشہور کتاب ہے۔ بمقام لکھنؤ سنہ ۱۲۳۲ھ (سنہ ۱۸۱۷ء) میں وفات پائی۔

مشکل سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسے لڑکے لکٹی سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا
سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کر دیں تو لچکی ہوئی دکھائی دے گی۔ شفاف
پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو اُبھرتی نظر آتی ہیں اور اسی طرح کی اور بہت
سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے
غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے اسی طرح
عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے۔ وہ بھی نقصان سے بری نہیں اور
اُس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لئے تو اختلاف رائے کی
دلیل کافی ہے۔ ہندسے کے علاوہ جس کے اصول بدیہیات پر مبنی
ہیں اور اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ ڈاکٹر، فلسفی، جج
البیٹرا، نومرز، سیٹ دان، پالٹیشنز، مدبران ملک، اہل مذاہب وغیرہ
وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں۔ منطق کے
قاعدے منضبط ہوئے۔ مناظرے کے اصول ٹھہرائے گئے، مگر اختلاف
نہ کم ہوا اور نہ تاقیامت کم ہو۔ وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ
رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔ جب سہت و نیست کا اختلاف ہو تو ضرور
ایک یکسر غلط ہے۔ اگرچہ عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی
مستنبط ہو سکتا ہے مگر ہم اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔
دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہل یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت
ہوئیں کہ کسی کو کیمیا کا نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اس کو عام بھی کر دیتا تو
اتنا فائدہ نہ پہنچتا جتنا کہ ان ماڈرن ڈسکوریز یعنی زمانہ حال کے دریافتوں
سے ہوا اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجودات نفس
الامری میں غور و خوض کرنے کی دھن لگا دی ہے۔ خدا اُن کی کوششوں کو

شکور دکا میاب کرتا ہے، تجربے باپایاں موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں
اور معلومات جدیدہ کے لئے بے بہا موتی ہیں کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں
وَاِن مِّن شَیْءٍ اِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ، اِن

ماڈرن ڈسکوریز میں سے زیادہ نہیں صرف ایک چیز عام فہم لو جس سے
انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ
دنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں ہر شخص بھاپ سے
بخوبی واقف تھا، سیکڑوں ہزاروں برس پہلے اسٹیم (بھاپ) کی طاقت
کیوں نہیں معلوم ہوئی۔ اور یہی سوال ہر ڈسکوری کی بابت ہو سکتا ہے۔
جو اب تک ہوئی یا آیندہ کسی وقت میں ہو۔ سر اسحٰق نیوٹن جس کو سب سے
پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر
میں بے شمار موتی بھرے پڑے ہیں اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچوں
کی طرح سیپیاں اور گھونگھے جمع کر رہا ہوں، یہ مقولہ تھا اُس شخص کا جس
نے زمین اور آسمان کے قلابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام
قائم کیا۔ اور آج سارا یورپ اس کے نام پر فخر کرتا ہے جن کو خدا نے
عقل دی ہے وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں اور ہمارے
زمانے کے انگریزی خواں ہیں کہ سیدھی سی اقلیدس کی نئی شکل پوچھو تو
بغلیں جھانکنے لگیں اور لن ترانیاں یہ کہ ہم چو ما دیگرے نیست، بس جوں
جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے عقل انسانی کا قصور ہے کہ کھلتا چلا
جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کسی کی عقل
میں یہ بات آسکتی تھی کہ مہینوں کی مسافت ہم گھنٹوں میں طے کر سکیں گے
یا ہزارہا کوس کا حال چند لمحے میں معلوم کر لیا کریں گے، یا آگ سے برف

جائیں گے، یا کپڑے کی کل میں کپاس بھر کر اچھے خاصے دھلے دُھلائے تہ کئے ہوئے کپڑے نکال لیا کریں گے۔ اور ابھی کیا معلوم کہ ہم کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہیں گے آدمی، عاجز ناچیز بے حقیقت، بھلا آدمی کیا عقل پہ ناز کرے گا، جب کہ اُس کو کہ پاس کے پاس اتنا تو معلوم نہیں کہ روح کیا چیز ہے، اور اس کو جسم کے ساتھ کیا تعلق ہے، وقت کے ازلی ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں، تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین بلکہ اس سے بھی کم اور اس ہستی انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے کہ گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا، پھر کیسے کیسے لوگ ہو گزرے ہیں کہ اس سرے سے اُس سرے تک ساری زمین کو ہلا مارا، اور مر گئے تو کچھ بھی نہیں، ایک تودۂ خاک۔ آخر وہ کیا چیز تھی جو ان میں سے نکل گئی، حیوانات، نباتات لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے پیدا ہوتے اور پھر اسی میں فنا ہو جاتے ہیں، کس کی عقل کام کرتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کس غرض سے ہو رہا ہے، جان تو ایک قسم کی نباتات میں بھی ہے، مگر جانوروں کے بہت سے افعال انسان سے ملتے ہوئے ہیں، بلکہ بعض حیوانات بعض باتوں میں انسان پر بھی شرف رکھتے ہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں تو اُن کے کمالات وہبی اور فطری ہیں۔ پھر وہ کون سی تکمیل ہے جس کے لئے ان کو یہ ہستی دی گئی ہے؟ انگریزوں نے تحقیقات کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا مگر شروع شروع سے اب تک کسی ایک جگہ یا کسی ایک چیز کسی ایک بات کا مسلسل پتہ نہ چل سکا۔ زمانۂ حال سے جس قدر پیچھے کو دور ہوتے جاتے ہیں۔ منظر تاریخ دھندلا پڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب سے چار پانچ

ہزار برس پہلے کا کسی کو کچھ حال معلوم نہیں کہ دنیا کا کیا رنگ تھا۔ عقل انسانی کی نارسائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ آج تک کسی پر کسی چیز کی ماہیت ہی منکشف نہ ہوئی۔ جانا تو کیا جانا اعتراض وہ بھی شاید نی صدی دو۔ مثلاً پانی کہ ہم اُس کا اتنا ہی حال جانتے ہیں کہ سیال ہے، سہل الانقیاد ہے، یعنی جو شکل چاہو آسانی سے قبول کر لیتا ہے، آمیزش سے پاک ہو تو شفاف ہے، نشیب کی طرف کو بہتا ہے، وزن مخصوص کے قاعدے سے ۳۳ فٹ سے زیادہ ہوا میں بلند نہیں ہو سکتا، حرارت کے اثر سے ہوا بن جاتا ہے، یا اگر علم طبعی کے کسی ماہر سے پوچھو تو شاید دو چار خواص اور بیان کر سکے گا۔ مگر یہ سب آثار ہیں نہ ماہیت، ماہیت کا نام آیا اور عقل گم ہوئی۔ اگرچہ ابن الوقت یا ہمارے ملک کے بڑے بڑے انگریزی خواں ہی کیوں نہ ہوں۔ بات کیا ہے کہ دنیا ہے۔ عالم اسباب یہاں واقعات کا ایک سلسلہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا واقعہ ہوتا رہتا ہے، ہم واقعۂ متقدم کو سبب اور علت کہتے ہیں اور واقعۂ متاخر کو مسبّب، معلول، نتیجہ، اگرچہ سبب کے قرار دینے میں اکثر چند در چند غلطیاں ہوتی ہیں مگر فرض کرو کہ ہم سبب کے قرار دینے میں غلطی بھی نہ کریں تاہم سبب اور مسبب میں جو علاقہ ہے آج تک اُس کا راز کسی پر نہیں کھلا کہ مثلاً جلانا آگ کا خاصہ ہے، مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے مگر کوئی نہیں بتا سکتا کیوں؟ ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو تو روئے زمین کے سارے ریگستانوں میں اتنے ذرّے نہ ہوں گے جتنے ستارے آسمان میں بکھرے پڑے ہیں۔ پھر یہ ستارے دیکھنے میں چھوٹے چھوٹے نقطے سے نظر آتے ہیں اور درحقیقت ایک ایک بجائے خود ایک جہان ہے

کہ ہماری زمین کی اس کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں۔ سوچنے سمجھنے والے
کو دنیا سر تا سر طلسم حیرت ہے، جب دنیاوی امور میں عقل انسانی
کی نارسائی کا یہ رنگ کہ کسی بات کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتی تو دین میں
وہ ہماری کیا رہبری کرے گی۔

تو کارِ زمیں را نکو ساختی　　کہ با آسماں نیز پرداختی

یہ دنیا تو پھر بھی عالم شہود ہے کہ ہم اس میں موجود ہیں اور اسے
آنکھوں سے دیکھتے اور تھوڑا یا بہت اس میں تصرف بھی کر سکتے اور کرتے
ہیں، دین خبر دیتا ہے کہ اس دنیا کے سوائے ایک جہان اور ہے، یہ ظاہر
ہے، وہ غائب ہے، یہ فانی ہے، وہ باقی، یہ مجاز ہے وہ حقیقت، یہ
تمہید ہے وہ نفس مطلب، یہ امتحان ہے، وہ نتیجہ، یہ سفر ہے، وہ منزل
مقصود، یہ خواب ہے وہ تعبیر، یہ افسانہ ہے وہ حق امر ظاہر ہے کہ عقل
انسانی کو اس جہان کے متعلق کچھ بھی نہیں جاننا چاہیے کیونکہ وہ اس
کی منتہائے رسائی سے بہت دور ہے، لیکن خدا کی بے انتہا مہربانی سے
بعید تھا کہ انسان جو اُس کی مخلوقات میں سب سے افضل ہے اس جہان
سے بالکل بے خبر رہے اور جس طرح اُس نے اور چیزوں کو دوسرے
خواص بخشے ہیں، عقل انسانی کو نیک و بد کی تمیز علیٰ قدر کی کہ جاہل سے
جاہل اور وحشی سے وحشی بھی بھلائی کی طرف راغب ہے نہ کسی دنیاوی
مفاد کی طمع سے اور برائی سے ہارب ہے، نہ کسی دنیاوی نقصان کے
خوف سے، بلکہ گویا انسان کا دل مقناطیسی سوئی ہے اور نیکی شمال
کی سمت، پس اس جہان کے متعلق ربانی، معلومات، واقفیت، کچھ
کبھی کچھ، یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی بالطبع نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند

کرتا ہے، پھر انسان کی عقل اپنی طرف سے کچھ کی نہیں کرتی، بہتیرا زور مارتی ہے کہ وہاں کی حقیقت دریافت کروں مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔

حال عدم نہ کچھ کھلا گزرے ہے زندگاں یہ کیا
کوئی حقیقت آن کر کہتا نہیں بڑی بخیلی

نیکی و بدی کے امتیاز کے ساتھ اس کو اتنی بات اور سوجھتی ہے کہ انسان کے ہر فعل کو ایک نتیجہ لازم ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض افعال کے نتائج اسی دنیا میں واقع ہو جاتے ہیں مگر بعض کے نہیں بھی ہوتے اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی نتائج کے علاوہ طبیعتیں کسی اور نتیجے کی منتظر رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حیات اور ہونا چاہیے اور اس کی ضرورت ہے اور نہیں معلوم کیا سبب ہے کہ دل خود بخود اندر سے گواہی دیتا ہے کہ مرنے سے تو ہمارا پیچھا چھوٹتا ہوا نظر نہیں آتا۔ مرے پیچھے ہم کسی حالت میں رہیں مگر رہیں گے ضرور بس یہاں تک عقل کی پرواز تمام ہوئی۔

اگر یک سر موے برتر پرم
فروغ تجلّی بسوزد پرم

مگر اس سے تو کچھ بھی کشود کار نہ ہوا، دل جو اس حیات کے تفصیلی حالات کے مشتاق تھے بدستور جویا کے جویا رہے۔ اب دین کی سرحد میں آگے بڑھنا چاہتے ہو تو چراغ عقل کو گل کر دو اور آفتاب جہان تاب وحی کو اپنا ہادی اور رہنما قرار دو۔

اس بیان سے اگرچہ مختصر ہے، معلوم ہو جائے گا کہ امور دین میں عقل انسانی کو کہاں تک دخل ہو سکتا ہے۔ ابن الوقت نے کچھ تھوڑی غلطی نہیں کی کہ مذہب کو محکوم عقل بنانا چاہا، پس اس کے مذہبی نظام

کی بسم اللہ ہی غلط تھی اور اس کو صرف اسلام سے اختلاف تھا بلکہ دنیا کے تمام مذاہب ۔ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنی تمام قوتوں کے استعمال میں مجبور ہے اور نہیں ہو سکتا کہ وہ عقل رکھتا ہو اور اس سے کام نہ لے مگر ہمارا مطلب یہ ہے کہ جسمانی یا عقلی جتنی قوتیں ہیں سب کے استعمال میں اعتدال شرط ہے اور علم اخلاق کا ماحصل بھی یہی ہے، اگر کوئی شخص عقل کو مذہب کی کسوٹی بنانا چاہے تو اس کو اس ارادے میں ایسی ہی کامیابی کی توقع رکھنا چاہیئے جیسی کہ وہ شخص رکھ سکتا ہے جو باصرہ سے سامعہ کا یا شامہ سے ذائقہ کا کام لینے کا قصد کرے ۔ دین کی دولت، طبیعت کی چالاکی، عقل کی تیزی اور ذہن کی رسائی سے ہاتھ آنے والی چیز نہیں، اس کے مستحق ہیں بھولے بھالے سیدھے سادے ۔ اَهْلُ الْجَنَّةِ بُلْهٌ (جنتی لوگ بھولے بھالے ہیں) متکسر، منقاد، افسردہ، متواضع، خاکسار، ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ جو شخص دین کی باتوں میں عقل کو بہت دخل دیا کرتا ہے شروع کرتا ہے جزئیات سے، فروع سے متشابہات سے، اور آخر کو جا پہنچتا ہے: کلیات میں، اصول میں، محکمات میں، جیسا کہ ابن الوقت کو پیش آیا پس جس شخص کی افتاد مزاج اس طرح کی ہو اُس کو شروع سے احتیاط کرنی ضرور ہے، چاہیئے کہ ایسے خدشات کو دور کر کے خدائے تعالیٰ جل شانہٗ کی عظمت، اُس کی قدرت، اُس کے جلال: دنیا کے انتظام اُس کے انقلابات اور کون و فساد میں فکر کیا کرے، امید ہے کہ اس کی طبیعت سنبھل جائے گی ۔

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں، ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فائدہ اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا، تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔

سرسید کی جس زمانہ میں نشو و نما ہوئی دلی میں اہل کمال کا مجمع تھا اور امرا اور رؤسا سے لے کر ادنی طبقہ تک میں علمی مذاق پھیلا تھا سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدرالدین

خاں، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا اور انھیں بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلہ علمی اختیار کیا وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔

اول وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے آہی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کا ایک مصرعہ اُنھیں کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے۔ ع

نام میرا تھا کام اُن کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کو شاعری سے مناسبت نہ تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی، چونکہ حقائق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا۔ اس لئے دلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت و کوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت اگر سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض بعض عمدہ نمونے موجود نہ تھے۔ خصوصاً میر امن صاحب کی چہار درویش جو ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی تھی اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجودہ تصنیفات کی ہمسری کا دعوی کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا یعنی عمارات اور ابنیہ کی تاریخ وہ تکلف اور آورد سے ابا کرتا تھا تاہم آثار الصنادید میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔

سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثارالصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیئے تھے۔

بہر حال اس کتاب میں جہاں جہاں انشا پردازی کا زور دکھایا ہے اس کا نمونہ یہ ہے۔

وہ ان حضرت کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے ارباب ذکا اور ناخن فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کہ واقعی معلوم ہو گیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو تو نقطۂ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لایتجزی کو دو نیم۔

اگرچہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۳۷ء میں مولوی محمد حسین کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا نام سید الاخبار تھا اور دونوں پرچوں کی زبان ضرورت کے اقتضا سے سادہ اور صاف ہوتی تھی، تاہم اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہیں

سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اسی وجہ سے آثار الصنادید میں جہاں انشاء پردازی سے کام لیا اسی طرز کو برتا۔

آثار الصنادید جس زمانہ میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً سنہ ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے، اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے تمام ہمعصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات، مثلاً رنج و غم، مسرت و خوشی حسرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے، اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھیر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہیں کہ اردو انشاء پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے۔ اس کا سنگ بنیاد در اصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔

سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے، اس لئے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

اسی زمانہ میں ہندوستان کے ہر حصہ میں کثرت سے اردو اخبارات جاری ہو گئے۔ اور اردو انشاء پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی ہو گئی، اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی،

تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا، اس لئے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔ تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا، اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔

سنہ ۱۲۸۷ھ میں جسکو آج کم و بیش ۷۲ برس ہوئے۔ سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا اور اردو انشا پردازی کو اس رتبہ پر پہنچا دیا، جس کے آگے ابھی ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں، سرسید نے اردو میں جو باتیں پیدا کیں۔ اس کو وہ مختصراً تہذیب الاخلاق میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ ان کی خاص عبارت یہ ہے۔

- جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم اور ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی، مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا، رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

اس آرٹیکل میں سرسید نے انشا پردازی کے اور بہت سے اصول بتائے ہیں۔ جن کو اس موقع پر ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے
مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے
اس درجہ پہ پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے، فارسی اور اردو میں
بڑے بڑے شعرا اور نثار گذرے ہیں، لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا
جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔

فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے، سعدی رزم کے مرد میدان نہیں،
نظامی رزم بزم دونوں کے استاد ہیں، لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں
ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے، برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق،
معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو
کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے، مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے
چیدہ چیدہ فقرے نقل کرتے ہیں، امید کی خوشی پہ ایک مضمون لکھا ہے
جس میں امید کو مخاطب کیا ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

دیکھو نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے، اس کی مصیبت
زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ
کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے، ہاتھ کام میں اور دل بچہ
میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے "سو رہ
میرے بچے سو رہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے
دل کی ٹھنڈک سو رہ، اے میرے دل کی کونپل سو رہ
پھول اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی
میں کبھی کوئی خار نہ چبھے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے
سو رہ میرے بچے سو رہ، میری آنکھوں کے نور اور میرے

دل کے سرور میرے بچے سورہ، تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت ہوتو ہم سے کرے گا۔ ہمارے دل کو تسلی دیں گی، سورہ میرے بچے سورہ، سورہ میرے پالے سورہ۔

"یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں، جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا، اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی، آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتشِ محبت کے بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا، رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سنانے لگا، اور جب کہ تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا، اور اپنے بے گناہ دل بے گناہ زبان سے بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا، تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں، اور ہماری پیاری امید، تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے۔"

"وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے، لڑائی کے میدان میں

جب کہ بہادروں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی
ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے'
دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی حرارت ہوتی ہے'
اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت
بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا
ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس
کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور
آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا
ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا
ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو! اور اے
بہادروں کی ماں' تیرے ہی سبب سے تحمندی کا خیال
اس کے دل کو قوت دیتا ہے' اس کا کان نقارہ میں سے
تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے"
تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی
ہے اور اس میں کس قدر درد اور اثر پیدا کیا ہے۔
پالیٹکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔
پنجاب میں جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی جس میں اورینٹل تعلیم
پر بہت زور دیا گیا تھا؛ سرسید کو اس سے خیال پیدا ہوا کہ اس
سے پالیٹکس کی بنا پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے' اس
وقت سرسید نے پے در پے تین آرٹیکل لکھے ان آرٹیکلوں نے یونیورسٹی
کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص ان آرٹیکلوں کے جواب میں سکڑوں

مضامین لکھے گئے، اور ان کا مجموعہ یکجا کرکے ایک مستقل کتاب تیار کی
افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم ان آرٹیکلوں کا کوئی حصہ نقل
نہیں کر سکتے۔

سر سید نے انشا پردازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کئے، ان
میں ایک یہ تھا کہ بہت سے اعلیٰ درجے کے مضامین کو اردو زبان کا
قالب پہنایا۔ لیکن ترجمہ کے ذریعے سے نہیں، کیونکہ یہ طریقہ اب تک
بے سود ثابت ہوا ہے، بلکہ اس طرح کہ انگریزی کے خیالات اردو میں،
اردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کئے۔ امید کی خوشی کا مضمون جس
کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کئے۔ دراصل ایک انگریزی مضمون
سے ماخذ ہے۔ انگریزی میں اڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گزرے
ہیں، سر سید نے ان کے متعدد مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا۔

سر سید کی انشا پردازی کا بڑا کمال، اس موقع پر معلوم ہوتا
ہے جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ اردو زبان چونکہ کبھی
علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی۔ اس میں علمی اصطلاحات
علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اس لئے اگر کسی علمی مسئلہ
کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے، لیکن سر سید نے
مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دلآویزی
سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا
ہے۔

پروفیسر رتیان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گزرا
ہے، اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ

وہ فلسفی مسائل کو ادا کرسکے"۔ دنیا جن مسائل کے ادا کرنے کے لیے عربی زبان کو ناقابل سمجھتا ہے (گویہ اس کا خیال محض غلط ہے)، سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دیے ہیں۔ سرسید نے فلسفۂ الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہے، وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں۔

زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہو سکا، کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی نہیں ادا کر سکتا۔

سرسید کی تحریروں میں جابجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے، لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ مولوی علی بخش خاں صاحب مرحوم جو سرسید کے رد میں رسالے لکھا کرتے تھے۔ حرمین شریفین گئے، اور وہاں سے سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لائے، اس پر سرسید ایک موقع پر تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:-

> جو صاحب ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہماری کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے ہوئے فتووں کے دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں۔

بہ بیں کرامت بتخانہ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد

سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور غازی کر دیا

اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا ہے، تو سرسید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے۔ اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں۔

"سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں، اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا، اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے، اِدھر ہات جھٹک دیا، اُدھر پیر جھٹک دیا اور انیٹھے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے، شاید ہمارے بھائیوں کی اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے، اگر یہ خیال ٹھیک ہے تو ہم کو بھی زیادہ تر چھیڑنا چاہیے، بچے اٹھاتے وقت کہا اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت لیور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی بابہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے، پی لے، تم چپکے ہو رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔ تو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو"

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو انشا پردازی پر جو اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل کے لئے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے، وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہیں، اور خوب لکھا ہو گا، میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جب کہ تمام ملک میں سرسید کا آوازہ ماتم گونج رہا ہے،

اور ہر شخص اُن کے کارناموں کے سُننے کا شائق ہے، کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیے۔ یہ اسی کی تعمیل کی، ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا، اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا۔

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل   اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

(محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڈھ مئی ۱۸۹۸ء)

فلسفہ اور تصوف

اگرچہ دنیا اپنی رفتار ترقی میں سابق کی بہ نسبت بہت آگے نکل آئی مگر اس وقت تک اس امر کا پتہ نہ لگا کہ انسان کی کمالی حالت کا منتہا کس مقام پر ہے۔ مختلف فلسفیوں کے قائم کئے ہوئے اصول پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد مختلف مذاہب کے اصول کا اندازہ کیجئے تو طبیعت ایک مخمصے میں پڑ جاتی ہے۔ شاید اسی سے بانیان مذہب کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہوگا کہ اُن عقلی نازک مباحث سے کم تعلق رکھنا چاہیے جو انسان کے خیالات پر کوئی نہ کوئی جدید اثر ڈال دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک تقلیدی طریقہ پر اس عہد سے پیشتر کے علما بھی فلسفیانہ مباحث پر نظر ڈالا کرتے تھے مگر تعلیم کے لئے جو طریقہ مغربی یوروپین سررشتہ تعلیم نے ایجاد کیا ہے، اُس کا یہ لازمی اور یقینی اثر ہے کہ انسان اپنے عالم خیال میں بالکل آزاد ہو کے مذہب اور فلسفے پر غائر نظر ڈالتا ہے اور دونوں کے درمیان میں ایک عمدہ فیصلہ کرنے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ بہ نسبت عربی

تعلیم کے انگریزی تعلیم نے زیادہ دہریے پیدا کئے۔ عربی کورس میں فلسفہ متعلق
کی کتابیں انگریزی سے زیادہ ہیں۔ مگر پھر بھی اس سے طبیعت پر اتنا اثر
نہیں پڑتا۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ عربی تعلیم سے کوئی دہریہ نہیں ہوا۔ نہیں ضرور
ہوئے۔ مگر یہ اندھیر نہیں ہوگیا کہ ایک سرے سے گویا دنیا میں مذہب کی
واجبی اور ضروری حکومت اٹھتی جاتی ہے۔

اگر ہم مذہب کے احکام کو اعتقاداً ضرور مانتے ہیں مگر ہم نے فلسفے کی
طرف سے آنکھیں نہیں بند کر لی ہیں، ہم خود بھی پسند کرتے ہیں کہ فلسفیانہ
اصول کا مذہب سے مقابلہ کیا جائے لیکن مذہب کی طرف توجہ کرنے
سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود فلسفہ کے دو مختلف اور متضاد
فرقوں کا جھگڑا چکا دیا جائے۔ اس لئے کہ جب تک اُن دونوں
کے مباحث طے نہ کر لئے جائیں فلسفے میں اتنی صلاحیت نہیں ہو سکتی کہ
وہ مذہب کے مقابل میں لا کے قائم کیا جائے۔ متقدمین سے متاخرین
تک اہل فلسفہ کے دو گروہ رہے ایک وہ لوگ جو تمام عالم کو عقلی
استدلالات کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ کہ تمام عقلیات کو چھوڑ کے
کے صرف روحانیات کی طرف جھکتے ہیں۔ پہلوں کو عربی فلسفے کی اصطلاح
میں مشائین کا خطاب دیا گیا ہے اور پچھلے اشراقیین کہلاتے ہیں یا یوں
کہا جائے کہ فلسفۂ مادی اور تصوف اور اس نے اسلام میں آکے دو اصول
دینی پیدا کر دیئے ہے: شریعت اور طریقت۔

پہلے تک اس امر کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے کہ آیا مشائین کی
پیروی کی جائے یا اشراقیین کی؟ پہلے فرقے والے تو ہمیشہ سے قائل
ہیں کہ اُن کے اصول سے کچھ لی جائے۔ اس لئے کہ وہ استدلال کے

عمدہ طریقوں سے کام لے کے کسی ایسے شخص کو سمجھا دینے کی کوشش کرتے
ہیں جو سمجھنا چاہتا ہو۔ مگر اشراقین یا صوفیہ نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے
کہ جب تک سالہا سال کوشش کرکے اُن کے اشراق نوری اور
مکاشفات سے اطلاع نہ حاصل کیجیے اُس وقت تک ممکن نہیں کہ آپ
سمجھ سکیے یا وہ سمجھا سکیں۔ جن لوگوں نے اتنی ہی بات پر صوفیہ سب کے
دعووں کو باطل قرار دے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے غلطی
کی۔ اس لیے کہ مادیین اور صوفیہ کے دعوے ہی بتا رہے ہیں کہ پہلوں کا
اصول قال ہے اور پچھلوں کا مدار صرف حال پر ہے۔

تصوف کیا چیز ہے؟ جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صوفیہ کی بڑی
بڑی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہی تصوف ہے تو اصل یہ ہے کہ وہ
ایک عظیم الشان غلطی میں مبتلا ہیں۔ تصوف صرف ان اثروں کا نام
ہے جو واقف کار صوفیوں کی بتائی ہوئی ریاضتوں سے دل پر پڑ جاتے ہیں جنھیں
وجدانیات کہنا چاہیے۔ انسان اُن سے لطف اور بے مزگی
حاصل کر لیتا ہے، مگر زبان سے نہیں ادا کر سکتا کہ اصل میں کیا چیز
ہیں۔ جیسے نور اور سرور کہ ان کی کیفیت کسی سے پوچھیے تو بیان نہیں
کر سکتا۔ مگر ہاں دل ہی دل میں لطف اٹھاتا ہے۔ لہٰذا جب تک
کوئی اُن کیفیتوں سے ناواقف ہو اور جو تصوف کی عملی ریاضتوں
سے دل میں پیدا ہوتی ہیں ہرگز اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اہل مادہ
کے ظاہری استدلالات کو سن کے اخفیٰ کیفیت نہ ڈگری دے دے۔ ہم
زمانے میں اکثر لوگوں کو اس غلطی میں مبتلا پاتے ہیں۔

آج کل ایک ہمارا سا شخص اگر دنیا کی سطح سے دیکھیے تو معلوم ہوتا

ہے کہ تصوف کا مدار مجرد خیالات پر ہے اور اُس کے مقابل میں دوسرا
فلسفہ خیالات ہی کا پابند نہیں رہا ہے۔ لیکن یہ بحث بھی حل ہو سکتی ہے
تو ایک اور امر کا فیصلہ کر لینے کے بعد۔ اس لیے کہ وہ فلسفہ جو تصوف کے
مقابل میں ہے۔ اُس میں بھی بہت بڑے بڑے تغیرات ہو گئے۔ ایک
قدیم اور اگلے زمانے کا فلسفہ تھا جس کی ترتیب نظام میں زیادہ دخل
ارسطو کو تھا۔ اور دوسرا جدید مغربی فلسفہ ہے جس کے اصول کو لارڈ
بیکن وغیرہ متاخرین حکمائے یورپ نے قائم کیا ہے۔ پہلا یونانی فلسفہ
جس کا زیادہ نہیں کل حصہ عربی میں موجود ہے۔ بلکہ اسلامی علما نے
جس کو اُس کی یونانی حالت کے مقابلے میں بہت کچھ ترقی دلا دی۔
اُس کی بنا بھی صرف خیالات ہی پر تھی۔ تصوف سے اگر فرق تھا تو اس
قدر کہ مقلدین ارسطو عقل کے عام محکمات پر مسائل کی بنا قائم کرتے
تھے۔ اور ہر طالب علم کو اُس کی عقل کے موافق تمام اصول حکمت پر اطمینان
دلا دیا کرتے تھے۔ بخلاف اس کے اہل تصوف ریاضات کے ذریعوں
سے اپنے خیالات پر خلوت میں بیٹھ کے غور کرتے تھے اور اُن سے
جو کیفیتیں اُن کے دل پر طاری ہوا کرتی تھیں، اُن پر اپنے فلسفے کی جو
اُن کا مذہب تھا بنا قائم کرتے تھے۔ لیکن اس پچھلے عہد میں صوفیہ تو
اپنی اُسی حالت اور انھیں اصول پر قائم ہیں مگر اہل مادہ جو پہلے
ارسطو کے فلسفے کو تسلیم و تنقیح کرتے تھے نئے اصولوں پر قائم کر لیا ہے
گذشتہ اور موجودہ مغربی مقلدین ارسطو کی طرح صرف ذہنی نتیجے
کے پابند نہیں ہیں۔ بلکہ انھوں نے دنیا کے قدرتی چیزوں اور تمام
مسائل کو سائنس کے اپنا بنا لیا ہے۔ وہ عقلی طور پر بحث کرتے ہیں۔

مگر اُن کے مباحث کا موضوع صرف خیال نہیں رہتا بلکہ دنیا پر اُس
حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں کہ اُس کی ہر چیز سے کون سا عملی مسئلہ نکل سکتا
ہے اور کون بات پیدا ہو سکتی ہے جو دنیا کے لئے بکار آمد ہو۔ یہ کلیں
اور یہ تمام آلات اُس عہد قدیم میں ہی پیدا ہو کے مروج ہو جاتے مگر
نہ ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن اگلے فلسفیوں نے استقرائیہ سے تو خیر
آج تک بحث نہیں مقلدین ارسطو نے بھی اپنے خیالات کو اس جانب
متوجہ ہی نہیں کیا۔ ان دنوں اکثر لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ اپنے
گذشتہ لوگوں کی کوئی عملی کارستانی نکال کے زمانے کے سامنے پیش
کر کے سرخرو نہیں مگر ہم بتائے دیتے ہیں کہ اُن کی یہ جستجو بالکل بیکار ثابت
ہوگی۔ اور اگر کوشش کر کے وہ کوئی ایسی بات نکال کے پیش بھی کر دینگے
تو یہ خوب جان لینا چاہیے کہ اُس کی ایجاد بحیثیت فلسفہ سرزد نہ ہوئی
ہوگی۔ بلکہ بحیثیت پیشہ یا تجارت کے کسی کاریگر کا ذہن لڑ گیا ہوگا
اور اُس نے کوئی ایسی چیز تیار کر دی ہوگی۔ اُس زمانے میں اس طرف
کسی فلسفی کا خیال متوجہ ہی نہیں ہوا تھا۔ ایسے نتائج ظاہر ہوتے کیونکر
خیر اب ہم پھر اس بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ تصوف کے
مقابل یہ دونوں قدیم و جدید عقلی فلسفے کیسے ہیں؟ یہ ظاہر ہو گیا کہ اگرچہ
غرض متحد نہ تھی مگر تصوف اور فلسفۂ قدیم دونوں کا مدار صرف خیالات
پر تھا۔ لہذا ہم کیا کریں۔ ہمارا نفس ہمیں مجبور کئے دیتا ہے کہ ہم تصوف
کو ترجیح دیں۔ اس لئے کہ ایک مسئلے کے حل کر لینے پر عالم خیال میں انسان
کو جو مسرت ہو جایا کرتی ہے۔ اُس میں دونوں شریک ہیں اور تصوف
کو اس قدر ترجیح ہے کہ خیالی ریاضتوں سے وہ اس قسم انکشافات بہت

سے عمدہ کمالات حاصل کرلے سکتا ہے۔ بخلاف اُس قدیم فلسفہ ارسطو کے جو ہوا اس کے کہ انسان اپنے دل ہی میں آپ ہی اپنے اوپر ناز کرے نہ کسی کے کام آسکتا ہے نہ اپنے لئے کوئی دنیاوی نفع حاصل کرسکتا ہے۔ رہا دوسرا جدید فلسفہ یورپ جس نے بہت کچھ کمالات تھوڑے ہی دنوں میں دکھا دیئے ہیں۔ دنیا نے اپنی وسیع مقدار عمر میں اتنی شان و شوکت نہ حاصل کی تھی جتنی اس فلسفے کی وجہ سے پچھلی دو ایک صدیوں میں حاصل کرلی۔ ہر انسان اُس فلسفے کے ذریعہ سے ایک نمایاں ترقی کرسکتا ہے اور بہت کچھ نفع حاصل کرسکتا ہے اور ثابت کردے سکتا ہے کہ ایک تھوڑی محنت سے انسان کس پایے پر پہنچ جاتا ہے اور اس سے کیسے کیسے اہم کام ظاہر ہو جایا کرتے ہیں۔ بخلاف تصوف کے کہ اُس کے معتقد جس طرح افلاطون کے مدرسہ الٰہیات میں بیٹھ کے مراقبہ کیا کرتے تھے اُسی طرح آج بھی اپنی خانقاہوں اور کوہستانات کی گھاٹیوں میں سرنہوڑائے بیٹھے ہیں۔ صوفیہ کو شاید یہ خبر بھی نہ ہوئی ہوگی اور فلسفۂ مادی نے عدالت کی کرسیوں تک پر قبضہ کرکے یہ فیصلہ کردیا کہ صوفیہ کے کشف و کرامات اور تمام وہ روحانی خوارق عادات جو تصوف کے ذریعہ سے حاصل ہوا کرتے ہیں سب خلاف نیچر اور غیر قابل اعتبار ہیں۔ بے شک تصوف کو اس جدید مادی فلسفے کے سامنے دب جانا پڑا۔ اور ہم کو بھی تمام نظام عالم کے دیکھتے موجودہ فلسفے کے حق میں یہی فیصلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اس کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف ایک ایسی چیز ہے جس کے اصول کو اگر عقل نہ بھی قبول کرے تو اُس کے سراپا ذوق جذبی خیالات کو ضرور اور بہت جلد قبول کرلیتی ہے۔

اور یہی وجہ تھی کہ زمانہ قدیم میں اگرچہ مشائین کا فلسفہ تصوف کی بیخ
کنی میں اپنی پوری قوت صرف کرتا رہا۔ مگر ہرگز کامیابی نہ حاصل ہوئی
اس عہد کے علما اگرچہ ہر فن اور ہر قسم کے علوم فلسفہ میں کمال حاصل
کرلیا کرتے تھے مگر اعتقادی حیثیت سے تصوف اُن کے دعووں پر
بالکل حاوی ہوجاتا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ تمام وہ مذاہب جن
کو حضرت ابراہیم کے خاندان کے سلسلہ دار پیغمبروں سے کوئی علاقہ تھا
اور جن کی بنا بہ ظن غالب عقلی فلسفے پر تھی۔ سب کے اصول تصوف
ہی کی زمین پر قائم کئے گئے۔ یہ سب باتیں اس امر کا ثبوت دے
رہی ہیں کہ فلسفہ ارسطو کو تصوف اور اشراقی فلسفے کے مقابل میں بالکل
کامیابی نہ ہوسکی۔ اس عظیم الشان فلسفہ کے خیالات صرف چند
مدرسوں کی دیواروں کے اندر محدود تھے۔ مسلمانوں نے اپنے عہد
میں اگرچہ اُس فلسفے کو یہاں تک ترقی دلائی کہ خاص مقامات سے
نکل کے عام بازاروں تک پہنچ گیا لیکن پھر بھی اشراق کے دلچسپ
اثر نے علما میں جو ذوق تصوف پیدا کیا وہ صرف ہمیشہ دمباحثہ کی
حیثیت سے نہیں رہا بلکہ مذہب کا ایک جزو بن کر اعتقادوں
میں گھس گیا۔ ہاں تصوف کے اس جہانگیر اثر کو اگر مٹایا تو
اس جدید فلسفہ نے جس نے دکھا دیا کہ ہمارے خیالات تصوف
اور نیز قدیم فلسفہ ارسطو کی طرح صرف دماغ میں چکر کھانے کے
لئے نہیں ہے بلکہ ان سے اگر غور کیا جائے تو بڑے بڑے نتائج پیدا
ہوسکتے ہیں۔ اس فلسفے کے حامیوں نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ
کرکے دکھا دیا۔ انھوں نے ثابت کردیا کہ ہمارے اصول اور ہماری

کوششوں سے نے دنیا کو کسی طالب علمانہ بحث میں اٹکائے نہیں رکھا بلکہ
دنیا کے لئے عمدہ عمدہ کلیں قسم قسم کے سامان مہیا کر دیئے۔ الغرض
یہ ایسے دلفریب دعوے ہیں کہ اب دنیا تصوف کی دلخوش کن باتوں کو
بھول گئی اور بھولتی جاتی ہے اور جدید فلسفہ فلسفۂ قدیم، تصوف بلکہ
مذہب تک کو مٹا کے اپنا قبضہ کرتا جاتا ہے اور در پردہ اس کے ساتھ ہی
ساتھ مذہب کو بھی نقصان پہنچاتا جاتا ہے۔ تصوف کے حامیوں کی بعض
پارٹیاں قائم ہیں اور کوشش کر رہی ہیں کہ افلاطونی اصول کو اس جدید
فلسفیانہ تہذیب کے دور میں مضرتوں سے بچائیں مگر موجودہ عصر کے
نامور فضلا اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی ان کی باتوں کو اسی طرح سنتے
ہیں جس طرح کوئی سن رسیدہ شخص بچوں کی بھولی بھولی باتوں کو سنتا
ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہی طریقہ تعلیم کچھ دنوں اور چلا گیا تو تصوف
کو دنیا میں بالکل شکست ہو جائے گی۔ ہمارے مشہور اہل طریقت اپنی
خانقاہوں میں اور ہندو جوگی کوہستانی نشیبوں میں یوں ہی بیٹھے
رہ جائیں گے اور زمانہ وہ پہلا ورق الٹ کے تصوف کو دنیا سے ناپید
کر دے گا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ مذہب کیا چیز ہے۔ اگر ہم علمی اصطلاحوں
سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مذہب ایک مزاج کا نام ہے جو فلسفہ
اشراقی و مشائی کے باہمی امتزاج سے پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تعریف زیادہ
عام نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ بعض مذہب اپنی اصلی حالت میں صرف تصوف
پہ قائم کئے گئے ہیں۔ مثلاً دین عیسوی جس کو سوائے اعتقادات کے
اور کسی عملی مسئلے سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ اسلام نے دنیاوی

انتقاموں اور احکام معاشرت کو دیگر مذاہب کی بہ نسبت بہت زیادہ لیا۔ لیکن اس پر سب مذہب متفق ہیں کہ اصلی چیز اعتقادات ہیں" جن کو صرف تصوف ہی سے تعلق ہے اور جو اصل میں تصوف ہی ہیں؛ لہذا جن بنیادوں کے باعث فلسفۂ جدید سے تصوف کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ انھیں بنیادوں کے مطابق مذہب کو بھی ضرر پہنچ رہا ہے اور یہی وجہ سے اہل مذہب کو ضرورت ہے کہ لازمی طور پر تصوف کے روحانی مسائل کو سنبھالیں ورنہ یہ جدید مادی فلسفہ مذاہب کو جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دے گا۔

شاید یہ جملہ ہم تیز کہہ گئے اس لئے کہ اہل مذاہب کو ناگوار گزرا ہوگا۔ اُن کے اعتقاد کے مطابق مذہب کی حفاظت کرنے والا خود خدا ہے اور جب خدا نے حفاظت کا وعدہ کر لیا تو ممکن نہیں کہ کوئی مخالفانہ کوشش کارگر ہو سکے۔ ہاں یہ بے شک صحیح ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی مذہب کی بیخ کنی کر سکے۔ مگر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اسباب زمانہ دیکھ کے آپ کو اس کی حفاظت ضرور کرنا چاہیئے۔ عیسائی ایک حد تک کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ مذہب اُن کے اصلی وطن سے جلا وطن ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جتنی یورپ میں کمی ہوتی ہے۔ اتنا ہی نقصان وہ یوں پورا کر لیتے ہیں کہ ایشیا کے دیگر اہل مذاہب کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں، مگر یہاں دیگر مذاہب کو صاف نظر آ رہا ہے کہ روز بروز نقصان پہنچتا جاتا ہے۔ یہ بڑی غلط کارروائی ہے کہ ایشیا کے مذاہب باہم لڑ لڑ کے اپنی ساری قوت آپس ہی میں ختم کئے دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن میں اور ضعف ہوتا جاتا ہے

اور تعلیم جو جدید فلسفیانہ خیالات بچپن سے دماغوں میں پیدا کرتی ہے
وہ سب کو اُڑا کے بخوبی تمام غالب آجاتے ہیں۔ ایسے وقت میں تمام
دنیا کو آپس میں مل کر ایسا مشن قائم کرنا چاہئے جو اتحاد کے ساتھ
اس فلسفے کا زور توڑنے پر کمر باندھے اور یہی مشن اگر قائم ہو سکا تو مذاہب
کے بچنے کی امید ہو سکتی ہے ورنہ آئندہ ایک ایسا زمانہ ضرور آجائیگا
جب مذہب کی حفاظت انسانی قوت کے دائرے سے خارج ہو جائیگی

ہم کو بالکل اُمید نہیں کہ مذہب اپنی موجودہ حالت سے فلسفے کے
حملوں کو روک سکیں اور جب تک جملہ مذاہب کی متحدہ قوت ایک عام
مشن مذکورہ تحریک کے لئے اور مندرجہ بالا اصول پر قائم کریگی
اس وقت تک ممکن نہیں کہ دنیا آفت سے محفوظ رہ سکے۔ جو فلسفے کی
صورت میں نمایاں ہوئی ہے۔ عیسائی بھی اس خیال سے غافل نہ
رہیں۔ اُن کی کوششیں ایشیا میں جو ظاہری ترقی کی صورت دکھا
رہی ہیں۔ یہ صرف چند روز کے لئے ہے۔ ایشیا بھی اب تھوڑے
دنوں میں ایشیا نہ رہے گا وہ یورپ ہوتا جاتا ہے اور جوں جوں ایشیا
یورپ کی صورت اختیار کرلیگا ووں ووں عیسائیوں کی کوششیں بیکار
ہوتی جائیں گی۔ لہذا ہم تمام مذاہبیوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں
اور درخواست کرتے ہیں کہ اب وہ تمام باہمی تنازعات کو چھوڑیں
اور اُن نوجوانوں کی طرف متوجہ ہوں جو دہریت کا وعظ کہتے پھرتے
ہیں۔

اگست ۱۸۹۳ء

اودھ پنچ

ہندوستان کے جس جس گوشے میں اردو زبان کا نغمہ سنائی دیتا ہے وہاں شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان اودھ پنچ مرحوم کے ذکر خیر سے آشنا نہ ہوں - اودھ پنچ نے تیس پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردے میں اخباروں کی دنیا میں سلطنت کی ہے اور اس کی پرانی جلدوں سے گورغریباں میں اکثر اہل کمال ہیں جن کے قلم کی دھاک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھی -

جس وقت اودھ پنچ نے دنیا میں جنم لیا - اُس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا - سنہ ۱۸۳۶ء میں پہلے پہل سرکار کی جانب سے ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی رخصت عطا ہوئی اور سنہ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نے زبان اور ظرافت کے چہرہ سے نقاب اٹھائی - اس چالیس[1] سال کے عرصہ میں اردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے - مثلاً لاہور میں اخبار عام اور کوہ نور کا دور تھا یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے - دہلی میں

---

[1] ان اخباروں کے اکثر حالات منشی بالمکند گپتا مرحوم کے اردو اخباروں کے تذکرہ سے اخذ کئے گئے ہیں جو بھارت متر اور زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

اشرف الاخبار کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وکٹوریہ پیپر سیالکوٹ سے
جاری تھا۔ کشف الاخبار بمبئی اور جریدہ روزگار مدراس میں
اردو کا نقارہ بجا رہا تھا۔ کارنامہ اور اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع
ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ کارنامہ کا کام تمام ہوگیا۔ اودھ اخبار ابھی
تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھے ہوئے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے
وہی جب تھا۔ ان کے علاوہ اودھ پنچ کی اشاعت کے قبل بہت سے
اردو اخبار اپنی پیدائش اور موت کی منزلیں طے کر چکے تھے۔ مگر قابل
غور یہ بات ہے کہ یہ اخبار محض خبروں کی تجارت کرتے تھے۔ بجز لارنس
گزٹ کے جو کہ میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق
پر رہتی تھی۔ عام طور سے ان اخباروں کا نہ کوئی خاص پولیٹیکل
یا سوشیل مسلک تھا نہ کسی مستقل دستور العمل کے پابند تھے۔ اردو
اخبار نویسی کی تاریخ میں اودھ پنچ اور ہندوستانی دو اخبار ہیں جنہوں
نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی
کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ ہندوستانی کا دور
اودھ پنچ کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولیٹیکل روشنی کے دماغ
کا یہ اخبار کرشمہ تھا اس نے بھی اپنی ذات کی طرح پولیٹیکل خدمت کے
لئے وقف کر دیا تھا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا، مگر پولیٹیکل اور
سوشیل معرکہ آرائیوں سے بے خبر تھا۔ اس کا مستقل سوشیل اور
پولیٹیکل مسلک تھا۔ اس صوبہ میں ہندوستانی کانگریس کا چراغ
سمجھا جاتا ہے، مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ
تھا۔ وہاں اودھ کی بجلی چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح

کے معاملہ میں اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستوں کے حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اس کی ذات سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہنچا۔ ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً انڈین پنچ بمبئی پنچ پائنکی پور پنچ وغیرہ اس کی تقلید میں نکلے مگر وہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کر ختم ہو گئے۔ زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہیں ملی۔ اودھ پنچ کا جادو اردو زبان پر عرصہ تک چلتا رہا اور اس طولانی زمانہ میں جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور میں آئیں اُن پر نظر ڈالنے سے اردو نویسی کے دربار میں ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہے تھے جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی، مگر قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ اُس کے دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے لطیف ظرافت اور تدلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اردو نثر کے ان جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہیں وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے۔ نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہیں محض روزمرہ کی باتیں ہیں، مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردہ سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرہ پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے۔ یاریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر

غور کرو اُتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر ...... جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بیکسی پر روتے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجۂ اعتدال سے گذر جاتی ہے اور ان کے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل جاتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر مذاق سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں۔ ایسا ہونا معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابل معافی ہے۔ اودھ پنچ کے ظریف اُس زمانے کی ہوا کھائے ہوئے تھے۔ جب مذاق و بے تکلفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیاں ہماری نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے اور یہی دنیا کا دستور ہے۔ ممکن ہے کہ جن باتوں کو ہم آج پھول سمجھتے ہیں وہ آیندہ نسلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں۔ ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کر کے اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اُس نے اردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اُتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا۔ ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔ اودھ پنچ کے پہلے رجب علی سرور کے طرز تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع دنیا وت

کی طرف مائل تھا۔ اُس زمانے میں جو اردو اخبار جاری تھے اُن کی زبان
ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اردو کہہ سکتے ہیں۔ آج نثر اردو
جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جا رہی ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا
بہت بڑا حصہ ہے۔ علاوہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے
والوں میں مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف حضرت احمد علی صاحب
شوق۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر نواب سید محمد آزاد۔ بابو جوالا پرشاد
برق۔ منشی احمد علی کسمنڈوی۔ حضرت اکبر حسین صاحب اکبر یادگار
نام ہیں۔ ان لوگوں کے نثر و نظم کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ ایک محض طرز نو کے موجد ہی نہیں ہیں بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہیں۔
ان کی عبارت شوخی و تازگی اور خداداد بے تکلفی سے معمور ہے۔
اور ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ نثر کے نامہ نگاروں
میں طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے اور تیز زبان کی
پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورہ کی صفائی کے اعتبار سے
ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلہ میں چوکھا ہے۔ احمد علی صاحب
شوق کے مضامین میں ظرافت کی شگوفہ کاری کے علاوہ زبان و
محاورہ کی تحقیقات کا خاص لطف ہے۔ حضرت کسمنڈوی مرحوم کی
عبارت خاص طور سے دلکش ہے۔ مگر فارسیت کا رنگ زیادہ ہے
ہجر کا رنگ خاص یہ ہے کہ اُن کی ظرافت مقابلہ اوروں کے بد مذاقی
اور طعن و تشنیع کے کانٹوں سے زیادہ پاک ہے۔ برق کی عبارت میں
ظرافت کا چٹخارہ بہت کم ہے۔ مگر زبان نہایت صاف اور ستھری ہے
آزاد کا قلم نوابزادوں کی بے فکری عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے میں

مشتاق ہے۔ منشی سجاد حسین کا طرز تحریر سب سے الگ ہے۔ مضمون کیا ہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے ذخیرے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنف سے باتیں کر رہا ہے۔ عبارت اکثر مختلف علوم و فنون کے پیچیدہ استعاروں سے گراں بار نظر آتی ہے مگر بیان کی تازگی کی وجہ سے پڑھنے والے کو ناگوار نہیں ہوتا۔ ظریفانہ نظم کے میدان میں حضرت اکبر دس قدم آگے ہیں۔ طبیعت کی خداداد شوخی اکثر زبان کی صفائی سے بازی لے جاتی ہے مگر عموماً سوشل پولیٹیکل اور مذہبی مسائل کے ظرافت آمیز پہلو جس خوبی کے ساتھ حضرت اکبر نے نظم کئے ہیں۔ وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ ان کا معیار ظرافت بھی اوروں کے مقابلہ میں لطیف تر ہے اودھ پنچ کی محفل ان ہی پر مذاق اور نورانی طبیعتوں سے آراستہ تھی اور اب بھی اگر کوئی شخص اردو زبان حاصل کرنا چاہے تو اودھ پنچ کے ٹوٹے کھنڈروں کی زیارت اس کے لئے ضروری ہے اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی پر مذاق اور دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرم۔ چہلم۔ عید۔ شب برات۔ ہولی۔ دیوالی۔ بسنت کے جلسے عیش باغ کے میلے رقص و سرود کی محفلیں، مشاعرے۔ عدالت کی روبکاریاں، مرغ بازی۔ بٹیر بازی کے ہنگامے۔ الکشن کے معرکے ایسے مشغلے تھے جو ہمیشہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کی طبیعتوں کے لئے تازیانہ کا کام دیتے تھے۔ ساقی نامے۔

بارہ ماسے۔ دوہے۔ ٹھمریاں۔ غزلیں۔ رباعیاں وغیرہ نظم کرنے میں
اس کے اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین ہر ہفتہ
ایک چھوٹا سا مضمون وکل علیہ الرحمہ کے عنوان سے لکھتے تھے جس
میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں
کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔

زندہ دلی کی یہ تمام تصویریں اودھ پنچ کے بوسیدہ مرقع میں
موجود ہیں۔ گلدستۂ پنچ کی دو جلدوں میں اُن کا پورا نقشہ اُتارنا
اتنا ہی مشکل ہے جیسے کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ مگر زمانہ کا رنگ
دیکھتے ہوئے جو کچھ ہو سکا اُسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے علاوہ
اودھ پنچ میں شاعری اور صحت زبان کے متعلق اکثر ایسے زبردست
مباحثے چھڑے جو مہینوں اور سالوں تک قائم رہے اور جن کی وجہ
سے اردو داں سوسائٹی میں عرصہ تک چہل پہل قائم رہی۔

پہلے معرکہ کا تعلق فسانۂ آزاد سے ہے۔ سرشار مرحوم ابتدا
میں اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے اور اس کے گہوارہ کے گرد بیٹھنے والوں
میں تھے۔ جس رنگ کا اودھ پنچ عاشق تھا اُسی رنگ میں وہ بھی
ڈوبے ہوئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ زمانہ کے جس انقلاب
نے دنیا کو اودھ پنچ کی صورت دکھائی۔ اسی نے سرشار کی طبیعت
کو بھی پیدا کیا۔

اودھ پنچ کے ایک سال بعد فسانہ آزاد کا سلسلہ شروع ہوا۔
یہ محض اتفاق تھا کہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے سرشار

نے یہ سلسلہ اسی اخبار میں شروع کیا۔ ورنہ فسانۂ آزاد کا دریا بھی اودھ پنچ کے چشمہ سے جاری ہوتا۔ کیونکہ دونوں کا مذاق تحریر یکساں ہے اور دونوں ایک ہی باغ کے دو پھول معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اودھ پنچ نے اودھ اخبار کو بنیا اخبار کا خطاب دے رکھا تھا اور اس کے حال پر اودھ پنچ کے ظریفوں کی خاص عنایت تھی۔ جب سرشار اودھ اخبار کے اڈیٹر ہوئے تو کچھ روز تک تو ذاتی مراسم کا پردہ قائم رہا لیکن رفتہ رفتہ طرفین سے طبیعتیں بے قابو ہوتی گئیں اور آخرکار فسانۂ آزاد پر اعتراضات شائع ہونے لگے۔ اودھ پنچ کا فسانۂ آزاد پر خاص اعتراض یہ تھا کہ جو بیگمات کی زبان اس میں لکھی گئی ہے وہ محلات کی زبان نہیں ہے بلکہ ماماؤں اور مغلانیوں کی زبان ہے۔ اس قسم کے اعتراضات کے دونگڑے عرصہ تک اودھ پنچ کے بادلوں سے برساکئے اور ظرافت کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ ان اعتراضات کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ضرور درست ہیں مگر زیادہ تر طباعی پر مبنی ہیں۔

اودھ پنچ کا دوسرا وار مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ مولانا موصوف کے دیوان کے مقدمہ میں شاعری کے اصلی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ جب یہ مقدمہ شائع ہوا تو اس بحث نے اودھ پنچ کی بارود کے لئے چنگاری کا کام دیا۔ اودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکایتیں تھیں۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطرتی شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔

اختلاف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں
مثنوی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی ہیں ان
کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعرا کے کلام سے لیا تھا جس کا لازمی منشا اودھ
پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعرا کی توہین ہو۔ ان خیالات کو
دلوں میں استقرار تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک
ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھار شروع اور یہ سلسلہ بھی مدت تک
جاری رہا جس عنوان سے اودھ پنچ کے شہسواروں نے پانی
پت[1] کے میدان میں طرارے بھرے ہیں[2]۔ وہ بعض صورتوں میں قابل
اعتراض ضرور ہے مگر نفس مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا
کہ اودھ پنچ کی شکایات بے بنیاد نہ تھی۔

تیسرے شکایت کی رونق داغ کی شاعری سے تھی۔ اودھ پنچ
نے داغ کی شاعرانہ عظمت کبھی تسلیم نہیں کی۔ اس کا ظاہری سبب
یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اودھ پنچ کی تاریخوں سے دونوں یعنی لکھنؤ
اور دہلی کی قدیم رقابت کا زخم ہرا تھا اور دوسرے جاننے والے
شاگرد اپنے استاد کی شاعری پر تمام لکھنؤ کو قربان کر چکے تھے۔ اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاگردوں کی بے اعتدالی کا خمیازہ غریب استاد کو اٹھانا
پڑا اور اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں ایک عرصہ

---

[1] اودھ پنچ میں کلام حالی پر جو اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی کے
عنوان میں مندرجہ شعر مولانا حالی کے وطن کی مناسبت سے لکھا جاتا تھا۔
[2] ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے۔ میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے۔

تک اٹھائیں جن کا رخ داغ کی شاعری کے علاوہ ان کے حسب و نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت پر فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانے تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزار نسیم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لکھنؤ کے مشہور قصہ نویس مولانا شرر نے گلزار نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراض شائع کئے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے۔ نسیم کا نام محض فرضی ہے۔ اودھ پنچ نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور سب سے بڑی گرفت یہ کی کہ اگر یہ مثنوی آتش کی تصنیف ہے تو اس میں زبان اور محاورے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرر نے اس اشارہ کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں جوش پر آگئیں اور اودھ پنچ کی بجھتی ہوئی آگ کچھ ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آگ دور دور تک پہنچی۔ گلزار نسیم کا قصہ تو دور کنار۔ رہا مولانا شرر کی زباندانی اور نثر نگاری پر اعتراض شائع ہونے لگے اور عرصہ تک نظم و نثر کی بخیئے ادھیڑیاں چھپوائیں۔ یہ سلسلہ بھی سال بھر بعد ختم ہوا۔ اس بحث کے غیر لطیف حصہ کے علاوہ نفس مضمون کے متعلق جو مضامین نکلے ان میں اکثر زبان و محاورہ کی تحقیقات کا خاص لطف موجود ہے۔

ان مباحثوں کے علاوہ اکثر دوسرے اخباروں سے بھی اودھ پنچ سے نوک جھونک ہوتی رہی۔ ان میں اودھ اخبار اور طوطی ہند پر اس کی خاص توجہ رہی۔ زبان و شاعری کی اصلاح کے علاوہ

اودھ پنچ کی پولٹیکل خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ اودھ پنچ ابتدا سے
رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگریس کے پہلے جو پولٹیکل
معرکہ آرائیاں پیش آئیں۔ اُن میں اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ
دیا۔ الحاق اودھ انکم ٹیکس البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اکثر
ایسے مضامین لکھے جن کا آج شائع کرنا موجودہ قوانین کے
جکڑ بند کو دیکھتے ہوئے مصلحت دور اندیشی کے خلاف معلوم ہوتا
ہے۔ اس نے والیان ریاست کی خوشامد سے اپنا دامن پاک
رکھا اور ہمیشہ اُن کی غفلت و عیش پسندی کا پردہ فاش
کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی قومی محبت کے وسیع دائرہ میں ہندو مسلمان
سب شامل تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں کی آمد کی خوشی میں
اودھ پنچ عید اور شب برات کے استقبال سے کم سرگرمی
نہیں ظاہر کرتا تھا۔ ہولی اور بسنت کے زمانے میں اس کا پرچہ
سُرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شائع ہوتا تھا اور رنگین
مزاج نامہ نگاروں کے ساقی نامے اور ترانے وغیرہ ہفتوں تک
چھپا کرتے تھے۔ اودھ پنچ ہندو مسلمانوں کے قومی اتفاق کا ہمیشہ
سے معین تھا اور اگر دونوں قوموں میں کوئی نزاعی امر پیش ہوتا
تھا تو اُسے ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس چونکہ
قومی اتفاق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی لہذا یہ بھی اس پولیٹیکل تحریک
کا دل و جان سے مددگار رہا۔ اس صوبہ میں منشی سجاد حسین
کانگریس کے رکن تھے۔ وبا وجود بہت سے انقلابات کے
جن کے دیکھنے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے منشی صاحب موصوف آخر دم تک

اپنی وضع پر قائم رہے۔ ابتدا میں جب سر سید مرحوم نے اپنی زبان
و قلم کے جادو سے اہل اسلام کا دل کانگریس کی طرف سے پھیر دیا تھا اُس
وقت سوائے اودھ پنچ کے کوئی اسلامی اخبار ایسا نہ تھا جو علیگڑھ
کے پولیٹکل پیپر کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔ ۱۸۸۸ء میں جب سر آکلنڈ کالون
سر سید مرحوم اور مقتت کے گنہگار راجہ شیو پرشاد کانگریس کا طبقہ
الٹنے کی فکر میں تھے۔ اُس وقت ہندوستانی کے مضامین اور پنڈت
اجودھیا ناتھ کی دھواں دھار تقریروں کے علاوہ اودھ پنچ کی نشتر
پرستہ اس قومی تحریک کی تائید میں اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ ۱۸۹۶ء
میں جب کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا تو شہر کے
چند کہنہ رسیدہ بزرگوں نے اس کی مخالفت کا غلغلہ بلند کیا۔ اس
مخالفت کی تردید میں ہندوستانی اور ایڈوکیٹ میں پند و نصائح
کے دفتر کھل گئے لیکن ان واعظانہ نکتوں کے مقابلے میں وہ مضمون
زیادہ کارگر ہوا جو اودھ پنچ میں الٹے بچے والی چیل چمار کے
عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اکثر مزاج ایسے ہوتے ہیں جو بحث یا
مذاق کے گڑھے گوشے نہیں قبول کرتے ہیں مگر ظرافت کی چاشنی
سے راہ راست پر آجاتے ہیں۔ اس صوبے کے پولیٹکل [illegible] تحریک
میں اس خدمت کا انجام دینے والا اودھ پنچ تھا۔ مذہبی اور قومی
رسم و رواج کی اصلاح کے بارے میں اودھ پنچ کا رویہ زمانہ
شناسی کی رفتار سے الگ تھا۔ اس نے محض علیگڑھ کے پولیٹکل
مسلک کی مخالفت نہیں کی بلکہ سر سید مرحوم کے نورانی دماغ سے
جو مذہبی اصلاح کی شعاعیں نکلیں اُن پر خاک ڈالنے کی کوشش کی

علیگڑھ کالج کو لامذہبی کا مرکز قرار دے کر اس کے بانی کو "نیچری" کا خطاب دیا۔ اور "نیچریہ مذہب" کا مضحکہ اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اسی طرح پردہ کی اصلاح اور تعلیم نسواں وغیرہ کے متعلق جو تحریک اہل اسلام میں مغربی تحریک کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کی بھی سخت مخالفت کی۔ پردہ کی رسم و تائید میں حضرت اکبر کے ذیل کا قطعہ زبان زد عام ہے ؎

بے پردہ کل آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اتنے بڑھ کر اصلاح پسند لوگ اپنے دانت پیسا کریں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے زیادہ لطیف ظرافت کا نمونہ اودھ پنچ میں مشکل سے ملے گا۔ کاش کہ یہ خداداد جوہر اصلاح و رفاہ عام کی کوشش میں صرف ہوتا۔

اودھ پنچ کی ترقی و وقعت کا راز بہت کچھ اس کے اڈیٹر کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ منشی سجاد حسین کا مزاج عجیب صفات کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں بھی کسی نے اُن کے چہرہ پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی۔ بیماری کے زمانہ میں اگر کوئی مزاج پوچھتا تھا تو کہتے تھے زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کا حال اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی تھی۔ دوا علاج سے مایوس ہو چکے تھے۔ مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ محض اس لئے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ مرنا کہتے تھے۔ اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری

اور تعصب سے کوسوں دور رہتے تھے۔ دنیا کے ناہموار و کا واک پہلو اُن کی نگاہوں میں خود بخود کھٹکنے لگتے تھے اور اُن کی پر مذاق طبیعت کو بلا لحاظ قوم و ملت بیتاب کر دیتے تھے۔ غیر کا ذکر نہیں ان کے دلی دوستوں اور عزیزوں کو اکثر ان کی بذلہ سنجی کا مزا چکھنا پڑا ہے۔ دوستوں کی معیت اور قدر شناسی کی بدولت انھیں ابتدا ہی میں اتنے ذہین اور طباع نامہ نگار مل گئے جو ایک وقت میں شاید کسی دوسرے اخبار کو کم نصیب ہوئے ہوں گے۔ یہ لوگ محض اودھ پنچ کے نامہ نگار نہ تھے بلکہ اس کے جاں نثاروں میں تھے۔ اسے اپنا اخبار سمجھتے تھے اور کسی دوسرے اخبار میں لکھنا کسر شان سمجھتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ رنگ قائم نہ رہا۔ بقول شاعر۔

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دس بارہ سال بعد اودھ پنچ کے شباب کی دوپہر ڈھلنا شروع ہوئی اور اس کے نامہ نگاروں کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا۔ ستم ظریف اور ہجر نے مرنے سے پہلے ہی لکھنا کم کر دیا تھا۔ جوانی کی بے فکری دوسرے نامہ نگاروں کا ساتھ عرصہ تک نہ دے سکی اور رفتہ رفتہ اودھ پنچ کے صفحے قدیم طرز کے پرانے مضامین سے خالی نظر آنے لگے۔ جو کچھ رہی سہی آب و تاب باقی تھی منشی سجاد حسین کی علالت نے اُس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس مٹی ہوئی حالت میں بھی اودھ پنچ کا نام بکتا تھا اور جب کبھی کوئی مضمون اس کے اڈیٹر کے قلم سے نکل جاتا تھا تو اُس

کی دھوم ہو جاتی تھی۔ علاوہ اس کے کبھی کبھی منشی احمد علی شوق نواب سید محمد آزاد اور حضرت اکبر کے نظم و نثر کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ مگر اودھ پنچ کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ منشی سجاد حسین کی حمیت و غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ جب تک اُن کے دم میں دم ہے وہ اسے اپنے آنکھوں کے سامنے بند ہوتا ہوا دیکھیں۔ مگر واقعات کا رجحان یہ ہے کہ آخر دس بارہ سال میں اودھ پنچ میں سوائے خسارہ کے کوئی نفع کی مد نہ تھی۔ منشی صاحب موصوف نے ایک خط منشی بالمکند گپتا کو لکھا تھا جو زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔

لکھتے ہیں "مکرمی تسلیم۔ خط پہنچا۔ بہت بجا ہے۔ اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اس لئے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں۔ دو ایک سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ منہ سے بول سکتا ہوں۔ کچھ تو کرہمت کر کے نکال دیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار بلا ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔ اخبار صرف اس لئے نکالتا ہوں کہ جیتے جی مر نہیں سکتا۔ ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں ع

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو۔ ہاں گذشتہ زمانہ میں کچھ تھا۔"

مگر یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ آخر کار مرنے سے دو سال پیشتر شکستہ دل اڈیٹر اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھوں سے اٹھانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ضعیف جسم میں خون کے دس بیس قطرے ضرور باقی تھے مگر گرہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا۔ گو کہ با وضع اڈیٹر کی یادِ دلی گور ہونے کے یہ تمنا ضرور رکھتی کہ

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

خیر اودھ پنچ کا جاری رہنا تو درکنار۔ یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر اودھ کا ایک عالی ظرف رئیس جس کی فیاضی ضرب المثل ہے دستگیری نہ کرتا اور وہ ایک پرانے دوستوں کی صحبت شریک حال نہ ہوتی تو شاید اودھ پنچ کا اڈیٹر نان شبینہ کا محتاج رہ کر دنیا سے سدھارتا۔

غرضکہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کر کے اودھ پنچ نے دنیا کو خیرباد کہا۔ اس وقت اردو زبان میں بہت سے قابل قدر اخبار موجود ہیں مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے اور زمانے کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہے گی۔

مگر اردو زبان کی تاریخ میں یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدر دانوں کے دلوں سے آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ آج اودھ پنچ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں۔ مگر اس کے تذکرہ سے سخن سنجوں کی محفل خالی نہیں ہے

چھیڑ کے آنکھوں میں مشتاق گزشتہ ہیں
دور جام مے میں اکثر ذکر خیر خم ہوا

چکبست لکھنوی۔

کھلے خط و سربستہ مضامین

نمبر ۱

خط بنام مسٹر گلیڈسٹن

مولوی گلیڈاسٹن صاحب طول عمرہٗ ۔ دعائے خیر نصیب شما باد۔
ایسے زمانے میں جب کہ چاروں طرف سے ہوائے شر و فساد ۔ ہر
ملک سے کوم بغض و عناد کے جھونکے آرہے ہیں ۔ تمھارے حق میں اس
سے بڑھ کر مناسب دنیا میں شاید ہی کوئی اور دعا ہوگی ۔

تم غالباً واقف ہوگے اور اگر نہیں تو اب کان کھول کر
سن لو کہ یہ تمھارا بوڑھا خاں ٹ ۔ تجربہ کار ۔ زمانہ دیدہ فلسفی
حکیم، مورخ ۔ پولیٹشن اور خدا جانے کیا کیا دوست ۔ ایسا تاریک
خیال اور ناسمجھ نہیں کہ محض ضد ۔ ہٹ دھرمی ۔ استبداد سے
کسی معاملے میں یک طرفہ رائے قائم کرے ۔ اور اس کے دوسرے
پہلو کی طرف سے عمداً اور ارادۃً اپنی دوربین اور باریک بین آنکھیں
بالکل بند کر لے ۔ آج کل ہزاروں دوست ہیں تو لاکھوں تمھارے
دشمن ۔ دس اچھا کہتے ہیں تو بیس برا بھی ۔ مگر یہ سب ہوا کے رخ
اپنا جہاز راستے چلا لے ۔ انصاف کا انجن ہرگز کام میں نہیں لاتے
لیکن یہ تمھارا اور ملکہ معظمہ کا سچا ۔ بے میل ۔ پکا ۔ سولہ آنے ڈبل

دوست خیر خواہ۔ جاں نثار۔ اور سچ ان عیوب سے ایسا دور
ہے جیسا راستی، ایمان، پاسداری دوستاں نمک حرامی سے۔ یہ
مصلحت وقت۔ دسترس انجام کار۔ سب باتوں پر غور کرنا۔ اور
تمھاری ذمہ داریاں۔ فرائض منصبی۔ مشکلات عہدہ کو خوب جانتا
بوجھتا ہے۔ بیشک تم کو چند آدمیوں نے بنالیا ہے۔ مگر واضح رہے
دو صورتوں میں بنایا جاتا ہے۔

اول جب واقعی اُس میں صفت بنائے جانے کی پائی جاتی ہو۔
اور کھلی یا ناپیدا ڈھب کا اُسے پاتے ہوں۔

دوسرے اگرچہ وہ فی الحقیقت اس قابل نہ ہو مگر اتفاقاً
کچھ حرکات سکنات یا علامات کی ظاہری صورت ایسی ہو جائے
کہ لوگوں کو غلط فہمی واقع ہو جائے۔

بہر نوع دل لگی یا ترنگ، دور سے تماشا دیکھنے والوں کا الّو
کبھی نہیں گیا۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے اور میں تمھارے افعال
ماسبق و حال پر انصافاً غور کرتا ہوں۔ کہہ سکتا ہوں کہ تم ہرگز
درحقیقت ایسے ہرگز نہیں جیسا تم کو آج کل لوگ خیال کرتے
ہیں۔

مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ تم بن گئے اور خوب بن گئے
بخت و اتفاق کو کوئی کیونکر روک سکتا ہے۔ نہ کلید اسٹن
مگر اب تو بدنامی کا ٹوکرا تمھارے ہی سر ہے اور سچ بھی یہ ہے
کہ اُس کے مستحق بھی تم ہی ہو۔ میں نے تمھاری فارن پالیسی
کبھی لائق ستائش نہیں پائی رفاہ و فلاح آرائش و زیبائش

ظاہری ٹیم ٹام۔ اور یہ ری لیپ پوت کے واسطے تمھاری ذات مخصوص
ہے۔ مگر کس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے
تم ایسے محروم جیسے ہندوستانی جودت سے۔ تم پولٹیکل دسترخوان
کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ پکا پکایا کھانا طیار
ہانڈی تم خوبی سے چن سکتے ہو مگر ہانڈی تیار کرنے اور چیز تیار
کرنے کے نام سے خاک دھول پکا ان کے پھول۔ تم نہیں جانتے کہ
طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون مصالحہ کیوں کر پیسا
اور ترکیب دیا جاتا ہے۔ کبابوں میں کس چیز سے گلاوٹ آتی ہے۔
پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں۔ فارن پالیسی کا زعفر اور زعفران کیونکر
خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں جو کوئی چمچہ ندرمادہ الٹتا
ہے اُس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہوا
ہو مگر اب یہ ضرورت بیشک معلوم ہوتی ہے کہ پہلے اچھا باورچی
اور رکاب دار سب تیار کرے۔ پھر دسترخوان لگائے اور خاصہ
چننے کے لیے تم بلا لیے جاؤ۔ تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کام
تمھارے سپرد ہوں۔ یہ خدمت کنسرویٹو ہی خوب جانتے ہیں
لیکن سر دست کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ اس دفعہ کے الٹ
پھیر میں تو تمھارا وہی حال ہوا۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید ۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کھانا تیار نہ سامان درست مگر دعوت ([illegible]) کی وہ دھوم
دھام کہ عالم گونج رہا ہے۔ ناخواندہ مہمان ہیں کہ چلے آتے
ہیں بلکہ ایک آدھ تو ہاتھ دھوکے قرار واقعی ہاتھ مارنے پر

مستعد ہیں۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو تمھارا قصور نہیں۔ جن لوگوں نے اس دفعہ تم کو بلایا اور وہ نہ سمجھے کہ کھانا تو اس دفعہ رکابدار دن نے ہنوز تیار نہیں کیا۔ ہم اُن کو باورچی خانے سے کیوں نکالے دیتے ہیں۔ اب عین وقت پر کون ہتھیلی پر سرسوں جمانے آتا ہے۔

اشارہ کنایہ برطرف صاف صاف یہ ہے کہ آج کل تمھارے واسطے بڑے بڑے افکار آموجود ہوئے۔ گو خزانہ و فوج و قوم ہر طرف سے اطمینان ہے۔ مگر کچھ تو شیطان مارتا نہیں پریشان تو ضرور کرتا ہے۔ خیر اس کی نوبت خدا نہ لائے۔ فی الحال اہل الرایوں نے تم کو ادبھی بوکھلا رکھا ہے۔ جو ہے اپنی ڈیڑھ کی مسجد الگ ہی اٹھاتا ہے۔ مگر صلاح کی صلاحیت ایک میں نہیں۔ سب اپنے دل کی آرزو پیش کرتے ہیں اور تم جانو صلاح و آرزو میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لحاظ سے میں اپنے دست و قلم کو تکلیف دیتا اور تمھاری دماغ خراشی کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو فارن معاملات آج کل کیسے پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ مصر اور وسط ایشیا کے معاملات تو سمجھو جو جمعہ مسجد کی طرح دور ہی سے سربلند کئے کھڑے ہیں۔ یا نئی ٹرکی کا تذبذب فوج کی حفاظت میں امیر کی تحاشی۔ برہما میں کشیدگی۔ مغربی افریقہ میں جرمن کی بیہودگی۔ یہ سب امور اگرچہ فرداً فرداً خفیف ہیں مگر بہیئت مجموعی اطمینان خاطر کے دشمن جانی ہیں۔ بُرا نہ لگے تو میں صاف صاف کہوں۔ اگر یہ دقتیں تمھاری قوم کے غلط قیاسات اور تفرضات سے پیدا ہیں۔ تم نے جو کچھ کسی قوم یا معاملے کی نسبت رائے قائم کی۔ وہ اکثر غلط نکلی۔

چنانچہ مصر کا معاملہ لیجئے۔ تم بغاوت کو قومی شورش نہیں سمجھے۔ مگر دیکھا۔ ایک
عربی گیا۔ مہدی سوڈانی۔ (یا سوڈانی آیا) اُس کو زیر کرد۔ دیکھو
کل ہی عثمان دغنا موجود ہے۔ عثمان کو بھگا دیا گرفتار کرد۔ دوسرے
کوئی اُن کے بھائی بند بلائے بوغنا پیدا۔ پھر آج تک خیال کرو۔
کتنی فتحیں پائیں۔ کتنی شکستیں دیں۔ باغیوں کو کیسے کیسے کتوئیں
جھکائے لیکن بارہ برس بعد کتے کی دم وہی ٹیڑھی۔ جب دیکھا
مصر کا قوام وہی بگڑا ہوا۔ کوئی بادشاہ ہو۔ صاحب تخت وتاج
ہو۔ اُس کو زیر کیا۔ تخت وتاج لے لیا۔ دار السلطنت پر قبضہ کیا۔
یہاں سب اک سرے سے لنگوٹی بند۔ خانہ بدوش۔ اِدھر سے
بھاگے۔ اُدھر ہوئے۔ اُدھر سے آئے اِدھر ہو رہے۔ بھلا ایسوں
سے الجھنا اپنی بات کھوتا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر کسی حصہ ملک کو
اُن کے حوالے بھی کر دیا۔ تب بھی مطلب حاصل نہ ہوگا۔ کیا وجہ
کہ مہدی ملک مانگتا ہے نہ سلطنت۔ اُس کو تو تجدید اسلام کا
خبط ہے۔ اُدھر اطمینان ہوا کہ کلے اور بڑی پر لپکا۔
وسط ایشیا میں تمہاری کارروائی چنداں قابل اعتراض نہیں
اُس کی وجہ یہ کہ تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ اچھا یا برا کیا کہا جائے۔
باقی اِس کاہلی سے جو نتائج پیدا ہوئے وہ بلاشبہ تم کو مجرم
ٹھیراتے ہیں۔ اس کی وہی مثل "کچھ نہ کرنا بھی بڑائی کرتا ہے"۔
یہاں تک تمہارا بس رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے۔ مگر اب تو
روس منحوس کے سر جا کر شیطان چڑھا۔ اب تو وہ خواہ مخواہ افغانیوں
دبچتا ہے۔

چونکہ یہ مضمون طویل ہے اور میں سمجھتا ہوں تم کو بھی آج کل کام
کی کثرت ہے۔ میں اس خط کو ناتمام چھوڑتا ہوں۔ اس بحث کو
دوسرے خط میں لکھ کر ان سب کے علاج بتاؤں گا۔ تم گھبرانا
نہیں۔ دیکھو اوسان نہ جانے پائیں۔ مگر بقول ایسے وقت میں
کام کا آدمی ہے۔ ڈفرن کی مستی ہی قابل صاد۔ زیادہ
عمرست درازباد۔

یورانی روشنی کا نامہ پیام

لندن ۔ رسل ۔ اسکویار

مائی ڈیر مولانا اودھو پنچ ۔ تسلیم ۔ اس روز مجھے آپ نے کانپور
کے اسٹیشن پر آکر رخصت کیا اور احباب نے رنگارنگ کے امام
ضامن ہمارے بازو پر باندھ کر خیرباد کہا اور آج دیکھیے بندہ عنایت
ایزدی سے لندن میں ایک مکلف اور آراستہ اور ہوادار ہوٹل
میں ایک غرور اور مسرت کے زور سے ایک عمدہ اور نفیس کرسی پر
بیٹھ کر آپ کو یہ خط لکھ رہا ہے ۔ اس خط کے مطالعہ سے آپ کو بخوبی
معلوم ہو جائے گا کہ ہم اپنے قول کے سچے اور وعدے کے پکے ہیں
اور شاید قلیل ہی عرصہ میں آپ اور ہمارے وطن کے دوسرے
احباب اس کو تسلیم کریں گے کہ ان لیدرٹ سے اب ایک
شستہ اور تہذیب یافتہ خیالات اور پکے تجربہ اور پختہ عقل
اور مستادینی عقیدہ کا آدمی اس ترقی انگیز ملک میں آیا ہے کہ جو
آئندہ ہماری ہر قسم کی اصلی اور واقعی حالات اور تمدنی اور
اخلاقی خیالات اپنے نیم وحشی ہم وطنوں کو آگاہ کر سکے گا اور
جو خدا کو آراستہ ولایتی اخلاق اور تمدنی دیوتا کو یہ سفر دیکھنے کا

دوربین بنے گا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم پرانے اسکول کے آدمی ہیں
اور ہمارے دل میں قدیم مدرسہ اور اُس کے علوم و فنون اور
پُرانے خیالات کا کیسا فیض بخش گنجینہ ہے اور ہم اپنی وضع
کے کیسے پاسدار اور پیار کرنے والے ہیں۔ کہیں جائیں کسی
ملک کا سفر کریں۔ مگر کیا معنی کہ اپنی وضع میں فرق آئے اور
اپنی قطع بدل جائے۔ یہ تو بہروپیوں کا کام ہے کہ روز ایک
نیا روپ لاتے ہیں اور اس ذریعہ سے اپنی روٹی کماتے ہیں۔
بندہ نے ڈوور کے قریب ہی جہاز پر اپنے ڈبل اور پرشوکت
اور سایہ دار اور کام دار جُبّہ میں اپنے کو لپیٹا۔ اُس پر سے ایک
بتیس فٹ کا شالی کمر بند بھی جڑ دیا۔ اپنی پالیسری دستار علم
کو بھی سر پر رکھا اور سبز رنگ کی بلند ایڑی والی کفش کو
بھی ڈانٹا۔ پھر کیا تھا ادھر جہاز سے اتر کر ریل پر سوار ہوئے
کہ تماشہ بن گئے جس کو دیکھو وہی ہم کو دیکھتا ہے۔ جس لیڈی
کی آنکھ پڑ گئی وہ مبہوت تحیر بن گئی کہ اسٹیشن والے جوق جوق
گاڑی پر آرہے ہیں۔ بیسیوں صاحبان عالیشان گاڑی میں
گھسے چلے آتے ہیں۔ لیڈیوں نے صاف مجھے عجائب المخلوقات
ہی بنا ڈالا اور میں اُن کے اس استعجاب کو دیکھ کر زیادہ
متحیر ہوتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہاں کے انگریزوں نے کسی
ایسا نِڈر متعصب اور خرانٹ مولوی کو اُس کے اصلی لباس اور
شان و شوکت اور ہیئت سے نہیں دیکھا تھا اور اس لئے
میری پذیرفتگاری کا وہ سامان ہوا کہ جزیروں کے وحشیوں

کے لیئے ہوتا ہے - خیر ان کا جو جی چاہے - مجھے کہیں گر ہم کبھی اپنے دل ہیں
اُن کو کچھ سمجھ لیتے ہیں اور اس سے لئے کسی فریق کو چاہئے شکایت نہیں
عوض معاوضہ گلہ ندارد مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل سلیم
بڑے زور سے میرے دل میں اس کی تحریک کرتی ہے - اس سے
قبل جو ہندوستان کے لوگ یہاں آئے ہیں وہ لوگ ہمارے یہاں
سے نہیں بلکہ کلکتہ و بمبئی سے صاحب بن کر آئے یا سوار ہوئے
تھے اور اس لئے وہ لوگ عجائب المخلوقات نہیں تصور کئے گئے
اور یہاں کے لوگوں نے اُن کو ہندوستان کی نئی روشنی کے فرقہ کا
دلیل یا کالے صاحبوں کا زندہ یادگار عزت آثار تصور کیا اور
اُن کے ساتھ اُس قسم کا برتاؤ خاص اور عام مجلسوں اور صحبتوں
میں ہوتا ہے کہ جو اپنے خاص لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے مگر یہاں
کے لوگ بدل اس کے خواہشمند اور متمنی تھے کہ کوئی قدیم اسکول
کا آدمی بھی یہاں آئے تاکہ اُس سے بہت دلچسپ باتیں کہ جن کے
بیان کرنے میں نئی روشنی والوں کو بہت ہی تامل ہوتا ہے -
دریافت ہوں اور وہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کی شکایت
اور حکایت کو اُس کے اصلی آب و رنگ اور دیانتداری کے
کے ساتھ بیان کرے - یہاں کے قابل اور بیدار مغز و زیرا
باہم لوگوں کے قومی رسم و رواج تعجب انگیز خیالات اور
قدیم مدرسوں کے حالات سے واقف ہونے کے بڑے مشاق
ہیں اور اُن کا قول ہے کہ اس قسم کی معلومات انگریزی دان
اور انگریزی خوان ناتجربہ کار طلبہ سے ہو نہیں سکتی ہیں کیونکہ

اول تو اُن کو خود بھی اپنی خبر نہیں اور شاید انگریزی تعلیم کے اثر سے
ابتدائے شباب ہی میں اُن کے خیالات پر مغربی تہذیب کی پالش
کر دی ہے۔ ان وجہوں سے میری خاطر تواضع حد سے زیادہ
ہوتی ہے اور میرے ساتھ یہاں کے لوگ اُس طرح سے پیش آتے
ہیں کہ جس طرح غیر ملک کے کسی دیندار اور نیک کردار عالم سے پیش
آنا لازم ہے اور میرے ہوٹل کے دروازے پر گاڑیوں کا ہجوم
رہتا ہے اور ہر شب کو کسی خاص یا عام جلسہ میں میری دعوت
ہوتی ہے شاعر، پولیٹیشن، ریفارمر، شعرا، وزرا، ممبران پارلیمنٹ
تجار، تاجر، پادری صاحب لوگ اور بعض بعض دیسی خاتونان
با نام و نشان کہ جو ہندوستان کی آئندہ ترقی کے اسباب کے
مہیا کرنے اور بہم پہنچانے اور ہندوستان کے باشندوں کی ہمدردی
کا چراغ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں روشن کرنے کی کوشش
کرتی ہیں اس فقیر کی ملاقات کو آتی ہیں اور مختلف امور اور مسئلوں
کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ یہاں کے علما اور پادری صاحب
لوگ بڑے وسیع الاخلاق منکسر المزاج متحمل اور ذی ہوش ہیں۔
اور اسی قسم کے لوگوں سے اور حکام سے زیادہ ملاقات رہتی
ہے۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز — کبوتر با کبوتر باز با باز

آپ کو حیرت ہوگی کہ ابھی تو مجھے یہاں آئے ہوئے دو مہینے
سے زیادہ عرصہ ہوا اور میں قلم ہاتھ میں لے کر یہاں کے حالات اور
خیالات اور رسم و رواج اور طریق معاشرت و تمدن وغیرہ وغیرہ

پہرا دینے کے لیے آکر بیٹھ گیا اور اپنے تئیں کے آدمی اور
کتے پیر شدی کا مصداق بنا دیا۔ مگر نہیں مجھے اس بات سے کہ عرصہ
میں یہاں کے لوگوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کے دیکھنے
اور جانچنے کا جو موقع ملا ہے ایسا شاید کسی کو سالہا سال میں نہیں
ملے گا۔ کیونکہ میرے رسائی کا حلقہ بہت بڑا ہے اور میرا گذر ایسے
ایسے مقامات میں ہوتا ہے کہ جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔

یہاں کے لوگ گویا آزادی کے عاشق ہیں اور نقش آزادی
گویا ان کے سینوں پر کندہ ہے۔ ان کو دولت حشمت اور ریاست
کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ مگر جہاں ان کی آزادی کو کسی نے انگلی
دکھائی۔ فوراً خون بہانے کو موجود ہیں۔ آزادی کے نشہ سے
کچھ انگلستانی لوگ ایسے مدہوش ہیں کہ اس کی ترنگ میں انھوں
نے اپنے سب قسم کے حقوق کو عورتوں کے ساتھ بانٹ لیا ہے
اور مرد و عورت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ معاذ اللہ یہاں
عورتیں گھوڑا دوڑاتی ہیں۔ ناچتی ہیں غیر مرد کے ساتھ پھرنے
جاتی ہیں دوکانوں میں بیٹھتی ہیں حقا پیتی اور کپڑا دھویا کرتی
ہیں۔ ہمارے عفت آباد ہندوستان کی عورتوں سے اگر یہاں کی
عورتوں کی بے پردگی اور بے شرمی اور دلیری کی کیفیت بیان
کر دی جائے تو ان کو فوراً شرم اور خوف اور غصہ سے اس قسم
کی حالت آجاوے کہ جوں شاخ چنار ان کو جلا دے۔ یہاں
کے مکانات وغیرہ سب بے پردہ ہیں اور یہاں کے لوگوں کا قول
ہے کہ کھلے مکانوں میں ہوا آتی جاتی ہے اور اسی سے صحت بحال

میں ترقی ہوتی ہے۔ خیر مردوں کے واسطے یہ مکانات بیشک
عمدہ ہیں مگر نہ کہ ویسے صاف وشفاف کہ جیسے ہمارے دہلی کے
اور لکھنؤ کے امراء کے دولت سرائیں اور زنانوں کے لئے تو یہ
مکانات بالکل ناموزوں ہیں۔ نہ بلند دیواریں نہ متعدد ڈیوڑھیاں
نہ تہ خانے نہ کنج قفس کی طرح پردہ دار پائیں باغ نہ چھوٹے
چھوٹے دروازے کی کوٹھریاں نہ محرابی بارہ دریاں نہ ہوادار
اور پردہ دار کوٹھے۔ مکانوں میں فن عمارت کے اصول سے دیکھیے
تو کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ صرف لکڑی اور اینٹ
کی سُرخی کا سادہ کام ہوتا ہے اور بڑے بڑے آئینے لگے رہتے
ہیں۔ البتہ کوچ میز اور کرسیاں اور بھی دوسرے سامان آرائش
قابل تعریف ہیں۔ مگر نہ کہ ایسی کہ اُن کو اپنے نواب زادگان
ہند اور والیان ملک کے مکانات اور ایوانوں کے ایرانی قالین
مخملی گاؤ تکیے فیل دندان کی چارپائیاں سونے چاندی کے
جھاڑوں رنگ برنگ کے شیشہ آلات اور طلائی اور
نقرئی اُگالدان اور حلبی آئینوں سے تشبیہ دے سکیں۔
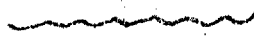
لیڈی کمشنر

دوگونہ رنج و عذاب است جان لیڈی را
بلائے فرقت پردہ و صحبت پردا

یاروسچ تو یہ ہے آدھا سچ بھی کیا چیز ہے۔ اس کی قدوم حدیت لزوم کی برکت سے وہ چہل پہل کچھ ردوبدل۔ ترمیم۔ اصلاح موجود ہوتی ہے کہ دلچسپی و دلفریبی کا ہر جگہ اثر قلعوں میں گولوں کی طرح رہتا ہے۔ ہمارے ناظرین کو یاد ہوگا کہ گورنمنٹ نظام نے ایک جدید تجویز کے ذریعے سے انگریزی انتظام پر بھی اس طرح لات مارنا چاہی تھی کہ عورتوں کی کمیشن کے واسطے ایک ہندوستانی لیڈی صاحبہ مقرر کی جائیں۔ چنانچہ ایسی لیڈی صاحبہ کے واسطے شرائط لیاقت مقرر ہوئے۔ اشتہار دیا گیا اور شمالی ہند سے ایک شایستہ تحیت فاطمہ صغرا بیگم نامی مقرر بھی ہوگئیں اور کمیشن بھی مل ہی گیا۔ مگر اتفاق دیکھئے کہ لیڈی صاحبہ کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اظہار دینے والے اگرچہ پردے میں رہیں گے۔ مگر مجھے وکلاء فریقین کے روبرو آنا ہوگا۔

بروقت کمیشن آپ نے بھی اصرار کیا کہ میں بھی پردے کے اندر بیٹھ کر اظہار لوں گی۔ وکلا کے سامنے ہرگز ہرگز نہ آؤں گی آخرالامر کمیشن دوسری لیڈی کے سپرد ہوا۔ اور اس معاملے

کی رپورٹ کی کیجئے۔ اب دیکھنا ہے اس تجویز کے پورے ہونے کی کون صورت نکلتی ہے۔ آیا۔ع

جب کو آئینہ پھر جائے گا جلا کے لئے

لیڈی صاحبہ جدید تہذیب کی اکسٹرا پالش کے واسطے پھر والیس کی جائیں گی۔ یا ایسے کمشنر کی خاطر سے دکلاعی تماشے مخصوص کئے جائیں گے۔ بہرحال کچھ ہی ہونا ہے تو دونوں بیجھئے۔ مگر فی الحال لیڈی صاحبہ کی وقت اور کشمکش کو تصور کر کے ہم نے خیالی اسٹیج پر جو فرضی سین کھینچے ہیں وہ ہم تذر ناظرین کرتے ہیں۔

تماشا
کمشنر کا مکان

لیڈی کمشنر۔ (خادمہ سے) اری ٹھورن ذری ادھر آنا۔ دیکھ آج ہمیں کمشن میں جانا ہے۔ ذرا نہانے کو پانی رکھ اور وزیرن سے کہہ دے جلدی کپڑے لا۔ میں نکال لوں۔ جھٹ پٹ پنڈا دھو ڈالوں۔ دو گھنٹہ اور مجھے کام پہ جانا ہے۔

ٹھورن خادمہ۔ بہت خوب حضور۔ اے بی وزیرن۔ اے بی وزیرن جلدی۔ بی بی یاد کرتی ہیں۔

وزیرن۔ آئی ماں آئی۔ آپ کو تو ہلو ہلو کام کی عادت ہے۔ تم ہندوستانیا جلدی کرتے ہو۔

(بی وزیرن صندوق لا کر جوڑا نکالتی ہیں اور لیڈی صاحبہ گھنٹہ بھر میں کپڑے منتخب کرتی ہیں۔

وکلا اور موکل ایک مکان میں

وکیل نمبر ا۔ آج بھی لیڈی کمشنر کا وزن دیکھنا ہے کیسی لائق اور مہذب ہیں۔ صورت کیسی ہے۔ مزاج کیسا ہے باتیں کیسی ہیں۔

وکیل نمبر ۲۔ اپن کو تو خبر لگی ہے کہ بہت ہوشیار ہیں مگر دیکھا نکو۔

وکیل نمبر ا۔ ابھی ہمارے نزدیک تو یک نہ شد دو شد۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ اختیار دینے والی اور کمشنر صاحبہ ہیں اگر ہمدردی کا مادہ جوش میں آیا تو سارا مقدمہ غارت ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں اس قوم میں کس قدر ہمدردی ہے۔

موکل۔ دیکھو کیسا ہو صاحب یہ باتاں اچھی نکو۔ اس کی کچھ تدبیر کرنا۔

وکیل نمبر ا۔ تم کیوں گھبراتے ہو وہاں چلو تو سہی۔

لیڈی کمشنر کا مکان

لیڈی صاحبہ۔ بعد غسل مصروف آرائش ہیں۔

لیڈی کمشنر۔ ارے کمبخت جلدی آ میری چوٹی تو باندھ دے اور دیکھ نیا جوڑا پوشاک نکال کر ادھر رکھ دے یہ میلا ہو گیا ہے اور چھوٹے کی کلھیا میں پانی ڈال دے پان تو نے ابھی تک نہیں دھوئے۔ اچھا چکنی ڈلی اور الائچی ڈبیا میں رکھ دے اور گاڑی کھینچنے کو کہہ دے۔ اور کھانا جلد لا۔ اے لو یہ تو میں بھول گئی تھی۔

ظہورن۔ (جی میں) آج بی بی کو یہ ہو کیا گیا ہے۔ ایک دم ہی تین کام چاہتی ہیں۔

(ظہورن کام کرتی ہے مگر عجلت میں لیڈی صاحبہ بہت ہی گھبرا کر

وزیرن کو پکارتی ہیں) "ارے ادھر آ کمبخت۔ خدا تجھے غارت کرے۔ کھانا لا۔ یہ تسلہ اور لوٹا درست کر۔ زیر انداز بچھا۔ دیکھ تو میری مانگ سیدھی ہے۔ مجھے جلدی میں اچھی طرح آئینے میں نہیں دکھائی دیتی۔

وزیرن ـــ ہو ایسی سیدھی جیسا تھا۔

(ظہورن مسکراتی ہے۔)

کمشنر ـــ (طمانچہ مار کر) قطامہ۔ حال زادی۔ ہم تو کام میں جلدی کو کہتے ہیں۔ آپ ہنستی ہے۔ وہ تو سہی غیابی دیکھ تو آ کر تجھ کو کیسا ٹھیک بناتی ہوں۔

ظہورن ـــ یا تو خدا دوسری دفعہ کا کام نہ دے یا مجھے اٹھا لے اگر یہی حال رہا تو میرا کچومر نکل جائے گا۔ پوشاک وغیرہ سے لیس ہو کر کمشنر صاحبہ بگھی پر سوار ہوتی ہیں کہ کاغذات مقدمہ یاد آتے ہیں۔

کمشنر ـــ اری وزیرن لپک جا۔ دیکھ وہاں گارڈ کے پاس کاغذ ہیں اٹھا لا۔ اور وہاں وہ سیاہ بکس بھی لانا اور روشنائی کی بوتل لیتی آنا۔ دوات میں روشنائی نہ ہوگی اور دیکھ اون اور گلدستہ کاغذوں پر لپٹا ہے۔ وہ رکھے آنا۔ مگر یہیں لیتی آنا۔ فرصت کے وقت بناؤں گی اور ہاں اے لو۔ ایک بات تو بھول ہی گئی نہ قلم تو باہر ہی ہے۔ اس کو بھی لیتی آنا۔ جلدی جا دیر ہو گئی۔ دو گھنٹے کی۔

اظہار دینے والے کا مکان

(وکلا و فریقین مقدمہ حاضر۔ مگر کمشنر صاحب ہنوز نہیں آئیں)۔

وکیل نمبر ا۔ اب تو وقت آگیا کمشنر صاحب نے بڑی دیر لگائی دو گھنٹے سے زیادہ گزر گئے۔

وکیل نمبر ۲۔ تعقیر آپ جانتے ہو لیڈی صاحب کا آنا ہے۔ آتے آتے آئیں گی

موکل۔ ابھی تک پردہ وغیرہ تو ہو رہے۔

وکیل نمبر ۳ کیا ہمیں بڑی دیر ہوئی۔ ہمارا ہرج ہوتا ہے۔ کمشنر صاحب سے کہنا چاہئے کہ اگر ایسی ہی دیر ہوگی تو ہم لوگوں کا نقصان ہوگا۔

وکیل نمبر ۲۔ عورتاں کی ذات سے سوا نقصان کے اور کیا ہونا۔ ابھی گھر ہو کر آیا۔ وہاں دیکھا پوٹے پوٹی کے واسطے جو کپڑا لایا تھا۔ گھر کے لوگاں نے سب خراب کر دئے۔ مقدمہ الگ اپن کو چین نکو دیتے۔

(اتنے میں سواری آئی۔ اور لیڈی صاحبہ زنانے میں گئیں پردہ پڑا)

وکیل فریق ثانی۔ کمشنر صاحبہ کہاں ہیں

خادمہ۔ ہیں پردے کے اندر ہیں۔

وکیل۔ صاحب اُن کو باہر تشریف لانا چاہئے۔ ہمارے روبرو اظہار لکھے جائیں۔

کمشنر صاحبہ (متعجب ہو کر) ایں کیا میں وکیلوں کے سامنے

آؤں گی - لو صاحب خوب ہوئی -

وکیل - یہ تو لازمی بات ہے -

کمشنر صاحبہ - یہ تو انہونی بات ہے -

وکیل - واہ واہ کمیشن کا ہے کو زچہ خانہ اور اظہار بچہ ہوا کہ پردے ہی کے اندر سب کچھ ہم کمشنر صاحبہ کو پردے کے اندر بیٹھ کر کارروائی نہ کرنے دیں گے -

خادمہ - کیا تم لوگ زبردستی کرتے ہو - کیسے بے پردہ ہوں -

وکیل - چپ رہ تو کون بولنے والی - تو قانون کا منشا کیا جانتی ہے

خادمہ - بلاتقصیر خاتون کا منشی خود مجھ سے بولا پردہ کے واسطے یہ بندوبست ہوا ہے - تم غارت گئے وکیلان بے پردہ کرنے آئے ہو - میری خالہ زاد بہن ماں خاتون نبیلہ پریس وکالت کئے این کو تاوقت تک بنا دیں -

کمشنر صاحبہ - صاحب سنئے میں یہاں بیگم صاحبہ کا اظہار لینے آئی ہوں - لے کر چلی جاؤں گی - آپ کے سامنے آنے سے کیا واسطہ؟

وکیل - جی نہیں - اظہار ہمارے روبرو لکھا جاتا ہے -

کمشنر - یہ ممکن نہیں ہے (غصے سے)

وکیل - تو وہ بھی ممکن نہیں (غصے سے)

کمشنر - زبان سنبھال کر بولو -

وکیل - آپ قاعدے سے کارروائی کیجئے -

کمشنر صاحبہ - تو یہ کبھی نہیں ہوگا عہدے پر پڑھے پٹکی میں

باز آئی - بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان - لو صاحب کیا عزت دنیا ہے نامحرموں کے سامنے غضب خدا کا پردہ کے واسطے تو یہ سب دقت ہوا اور خود کمشنر بے پردہ - میں جاتی ہوں - باز آئی ایسے پیچھے ہزار نعمت کھائی -

فریق - جس کی طرف کی گواہی ہے - اجی آپ ٹھہریں تو سہی غصہ نہ کیجیے -

کمشنر - غصہ کیسا یہاں آبرو دریں ہے - لو صاحب مجھے . . . . . نے دھوکے میں بلا یا میں یہ عہدہ کیوں قبول کرتی (زنانہ نیچر کے جوش میں کمشنر صاحبہ رو دینے لگتی ہیں اور جلسہ برخاست)

ارکان نظام گورنمنٹ

رکن نمبر ۱ - فاطمہ صغرا بیگم کو آج ایک کمیشن میں جانے کا اتفاق ہوا وہاں پردہ و بے پردگی کی بحث آئی - اُس کی رپورٹ آئی اُنھوں نے وکلا کے سامنے آنے سے انکار کیا -

رکن نمبر ۲ - ہاں پھر آپ کیا نسبت چاہیے -

رکن نمبر ۳ - کوئی ایسی لیڈی ہو جو بے پردہ ہوتی ہو -

رکن نمبر ۱ - مگر ان کا مطلب جو کیا تھا -

رکن نمبر ۳ - تو قاعدہ میں اصلاح ہو -

رکن نمبر ۲ - بھلا کون سی اصلاح -

رکن نمبر ۴ - اگر آپ میری رائے مانیں تو ایک مکمل تجویز پیش کروں

اس سے یہ ساری دقتیں دفع ہو جائیں گی۔

رکن نمبر ۱۔ وہ فرمایئے۔

رکن نمبر ۴۔ عموماً خواجہ سراؤں کو کمیشن دیا لیجئے یہ مردوں عورتوں دونوں میں کاروائی کر سکتے ہیں۔ علاوہ آسانی کے جدت بھی ہے۔ غالباً آپ سب صاحب اس تجویز کو ناپسند نہ کریں گے۔

(ڈراپ سین)

میرا مذہب اور سیاست

ہمدرد ۳ دسمبر ۱۹۲۶ء

خواجہ حسن نظامی صاحب نے مجھ پہ یہ الزام بھی لگایا ہے کہ میں سیاست کو مذہب پہ مقدم رکھتا ہوں اور ان کے حواری نے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہم دونوں سے واقف ہیں۔ غریبوں کے اخبار میں خواجہ صاحب کا اور میرا معاملہ فیصل فرماتے ہوئے اور میرے مذہبی روپ کی شرح دے کر ارقام فرمایا ہے کہ اس وقت مولانا محمد علی کا فقرہ جو انھوں نے ایک دن اپنے چند انگلستان رسیدہ دوستوں کے اعتراض کے جواب میں کہا تھا۔ بار بار ذہن میں آرہا ہے۔ دوستوں نے پوچھا تھا کہ محمد علی یہ اتنا پڑھ لکھ کر اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائیٹیوں میں رہ کر تم نے مذہبی جامہ کو کیوں پہنا ہے۔ کیا سیاسی خدمت سیاسی شکل میں رہ کر ممکن نہ تھی ارشاد ہوا ہم عوام تک فقط مذہب ہی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ انگریزی میں گفتگو تھی اور یہ الفاظ مولانا کی زبان سے نکلے تھے "WE CAN

I'll reach mob only throu religion ۔ اس الزام
کے جھوٹے ہونے کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہوگا کہ مجھ پر ہندوستان کے
ہندو مسلمان سیاسیین سب یہ الزام لگاتے ہیں کہ سیاست میں مذہب
کو داخل کر دیا ہے اور مسز بیسینٹ نے جو خود روحانیت میں غرق ہیں
مجھے "mad mulla" دیوانے ملا کا لقب عطا فرمایا ہے ۔
بحمد اللہ کہ میں ابتدا ہی سے مسلمان تھا ۔ یعنی اسلام کے کسی حکم کے خلاف
میرا ایمان نہ تھا ۔ اور ہمیشہ سے خدا کو ایک اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو اس کا برحق اور آخری رسول مانتا تھا ۔ لیکن جس زمانے
میں میں پیدا ہوا تھا وہ لڑکے جنہیں عربی مدارس میں تعلیم نہیں دلائی جاتی
تھی بلکہ جو انگریزی مدارس میں داخل کرا دیے جاتے تھے ان کی دینیات
کی تعلیم نہایت ناقص ہوتی تھی اور باوصف سر سید احمد خاں مرحوم
کے ارادے کے کہ علی گڑھ میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم
دلائی جائے ۔ وہاں بھی مجھ جیسے طلبا کی دینی تعلیم صرف برائے نام
تھی ۔ جامعہ ملیہ کے متعلق میں نے نہ صرف "کمریڈ" میں بلکہ ہمدرد میں
بھی اس حقیقت کا بالتفصیل اظہار کیا ہے اور ہمدرد کا مضمون اب
رسالہ جامعہ میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے ۔ پھر زمیندار کے بہم اعتراضات
پر کہ میں کسی عربی مدرسے کا فارغ التحصیل نہیں ہوں اور اس کی
دستار فضیلت میرے سر پر کبھی نہیں بندھی ' میں نے اپنی زندگی
کا تعلیم دین کے نقطۂ نظر سے تبصرہ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں
شائع کیا ہے ۔ خواجہ صاحب نے ۲۰ کالم ایک بار سیاہ کئے اور
اب وہ اور ان کے حواری دس دس بارہ بارہ کالم اب بھی سیاہ کر لیا کرتے

ہیں۔ لیکن میری ایک تحریر سے خواجہ صاحب ملے یا اُن کے حواریوں
نے یہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کی کہ میں نے کبھی بھی عمداً سیاست
کو مذہب پر مقدم رکھا، اور وہ تاقیامت اسے ثابت نہ کر سکیں گے۔
ان کی یہ تمام تحریریں مکڑی کے جالے سے زیادہ قوت نہیں رکھتیں
اور دنیا میں سب سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر
ہوا کرتا ہے۔ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ
لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ ۱۷ اکتوبر کے ہمدرد میں
خواجہ صاحب میرے قومیت اور ملیت کے مضمون کو پڑھیں، اور اگر
توبہ کا دروازہ کبھی وہ پہچانتے تھے اور اب بالکل بھول نہ گئے ہوں
تو اسے کھٹکھٹائیں۔ خدا ان کو معاف کرے میں ان کو ابھی سے
معاف کئے دیتا ہوں۔ میری پہلی زندگی اور بعد کی زندگی میں
علاوہ بیشتر پابندی احکام شریعت کے بس اس قدر فرق ہے کہ
پہلے میں اسلام سے کم واقف تھا اور ایک معنی میں اس پر بڑی حد
تک ایمان بالغیب تھا۔ اور جب سے نظربندی کے زمانے میں میں نے
قرآن کریم پہلی بار شروع سے آخر تک بامعنی اور سمجھ کر پڑھا میں سمجھتا
ہوں (اس سے زیادہ کیا دعویٰ کروں؟) کہ میں اسلام کے جوہر
اور اس کی روح کو سمجھ گیا ہوں، اور قریب یورپ و ایشیا کے بعض ممالک
کے مشاہدے نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ مذہب اسلام تفسیر حیات ہے
اور زندگی کے لئے آخری اور بہترین نظام ہے اور قدرت ہماری
اصلاح انہی نظام کے اختیار سے ہو سکتی ہے بلکہ نظام عالم اس وقت تک
درست نہ ہونے پائے گا جب تک بلا جبر و اکراہ کل اسلام نہ مانی

دنیا میں قائم نہ کردیا جائے گا۔ خدا کرے خواجہ صاحب اور ان کے
حواری بھی اس چیز کو سمجھ گئے ہوں گے اور خدا ان سب کو اور نیز مجھے
اس ایمان کے علاوہ عمل صالح کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ میرا رنگ
درو پ مودرازوں کا بہروپ نہیں بلکہ اس آیہ کریمہ پر ایمان کا نتیجہ
ہے کہ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ اللہ کے رنگ
سے کون سا رنگ اچھا؟

جزو و کل کا فرق

"ان غیر جانب دار؟ صاحب نے خواجہ صاحب کی تائید میں
جھوٹ بھی بول دیا اور ساتھ ہی ساتھ غلط انگریزی بھی —
we can reach mob only through
religion نہ میرا جملہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ
سے ایک جعلی خط بنا کر مجھ سے منسوب کیا گیا تھا۔ مگر انگریزی اس قدر
غلط تھی کہ میں بھی بری کر دیا گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کسی معلم اول کی
کارستانی تھی۔ یہ فقرہ یا تو ان خواجہ صاحب کا ہو گا۔ جن کی انگریزی
"فرام قبلہ ٹو شملہ" سے شروع ہو کر "کم ٹو موت" تک جاتی ہے
یا کسی خواجہ تاش کی جو ایک پیر دین میں رکھتے ہیں اور ایک دنیا
میں اور فرام پلین ٹو ہل ہر جگہ گھستے رہتے ہیں۔ میں اگر کوئی اس
قسم کا فقرہ اپنی زبان سے نکالتا تو کہتا۔
"We can reach God through religion"
(ہم خدا تک فقط مذہب ہی کے ذریعہ سے پہنچ سکتے ہیں)

عشق کے متعلق بائرن نے لکھا ہے کہ وہ مرد کی زندگی میں فقط
ایک علیحدہ چیز رہے، مگر وہ عورت کی تو ساری زندگی ہے۔ خواجہ
صاحب مذہب کے عشق کے مرد میدان ہیں، مگر یہ اُن کی روزمرہ
زندگی سے علیحدہ فقط ایک جزو ہے۔ گو ان کا رزق کل کا کل اسی
کے ذریعہ سے ملتا ہے، لیکن جب سے میں مذہب کو سمجھتا ہوں وہ
میری ساری زندگی ہے۔ لیکن میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا جس
طرح اسے وہ سمجھتے ہیں، میں بھی اُسی طرح سمجھتا ہوں۔

لکھنے کو تو اس قدر لکھ گیا مگر سوچتا ہوں کہ آخر اس سے کیا
حاصل ہے؟ میری زندگی بھر میں کبھی کسی کو یہ دھوکا نہیں ہوا کہ میں درگاہ
میں ہوں یا جب کہ تھیٹر میں "نکھراج پری" کا ناچ دیکھ رہا تھا۔
نہ میری آنکھیں اس طرح سرخ اور خمار آلودہ ہوئیں کہ آنکھیں دیکھ کر
کسی کو شب زندہ داری اور عبادت کا گمان ہوا ہو حالانکہ ان نیم باز
آنکھوں میں ساری مستی کسی اور شے کی تھی۔ میں جس رنگ میں رہا
سب کے سامنے رہا اور آج بھی جس رنگ میں ہوں سب کے سامنے
ہوں۔ بہت سے ایسے سجدے ہیں جو میرے ذمہ تھے مگر میں نے نہیں
کیے مگر خدا ہی جانتا ہے اور اس کے بندے بھی کہ وہ سجدہ ایک بار
بھی میں نے نہیں کیا جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے ؎

بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد — کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

.... کی سمت تراشی پہ اس قدر وقت ضائع کرنے کی حقیقتاً
مجھ جیسے گنہگار کو بھی حاجت نہیں ہے۔ جو روزہ ہے میں نے صرف
چہرہ کو بگاڑا ہے۔ صفائی باطن کرنے کی اسے ضرورت ہے نہ کہ

میری صفائی صرف اسی قدر کافی ہے کہ میں نے آج تک کوئی "آپ بیتی" نہیں لکھی۔ لیکن لوگ میری زندگی کے ہر حصے سے واقف ہیں اور وہ سب کے دیکھتے گزاری گئی ہے اور اب تک گزاری جا رہی ہے جلوت ہی جلوت ہے۔ اس میں خلوت کا نام نہیں اور اگر قید تنہائی کی وجہ سے کچھ خلوت نصیب ہوئی تو اس کے متعلق بھی اس قدر کشف و کرامات کا دعویٰ کیا ہے کہ ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ان سے نکلیں ہونے خلوت کی ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

تسنیم کے وعدے ہیں کوثر کے تقاضے ہیں
ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

میں ایک فاسق و فاجر ہوں اور اپنے فسق و فجور پر نازاں نہیں بلکہ نادم لیکن عفو و مغفرت کا امیدوار، نہ میں صوفی ہوں نہ عالم لیکن جب کبھی سجدے میں جاتا ہوں اس کی کوشش کرتا ہوں کہ اپنے مسجود کو دیکھوں اور اُسے نہ دیکھ پاؤں تب بھی یقین رہتا ہے کہ وہ ضرور مجھے دیکھ رہا ہے۔ حقیقتاً ؎

نہ نماز آتی ہے مجھ کو نہ وضو آتا ہے
سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

پھر اس سے فارغ ہو کر دست دعا اٹھاتا ہوں اور ایک اور کا خیال
یہ کہہ لیتا ہوں ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

عشرۂ محرم الحرام

شمع باید وام از صدق بخاک شہدا
تا دل و دیدہ خوں بار نہ فشانم دادند

آئیے! سب سے پہلے آج ایک بھولی ہوئی مصیبت ماتم کو پھر تازہ کریں۔ کتنے دن گذر گئے کہ راہ و رسم ماتم و شیون سے ناآشنا ہیں۔ نہ صدائے ماتم کی فغاں سنجی ہے اور نہ چشم خونبار کی اشک افشانی۔ کاروبار غم کی رونق افسردہ ہو چلی ہے اور روز بازار درد کی چہل پہل مدت سے موقوف ہے۔

نہ داغ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کارد!
بدہ یارب دلے کیں صورت بیجاں نمی خواہم

طرابلس کے خون آلود ریگستان کو اگر لوگوں نے بھلا دیا، مشہد مقدس اور تبریز کا قصۂ الم اگر ذہنوں سے محو ہو گیا، مقدونیا اور البانیہ کے تازہ ترین افسانہ ہائے خونیں اگر فکر دل سے فراموش ہو گئے تو کچھ مضائقہ نہیں ارباب درد و غم کے لئے ایک ایسی داستان الم

صدیوں سے موجود ہے جو کبھی بھلائی نہیں جا سکتی اور اگر لوگ
اُسے بھلا بھی دیں تو بھی ہر سال چند ایسے ماتم آلود دن تازگی
زخم کہن کے لئے آموجود ہوتے ہیں جو ازسرنو ایک ہزار ڈھائی سو
برس پیشتر کے ایک حادثہ عظیمہ کی یاد پھر سے تازہ کر دیتے ہیں۔

اب کے کچھ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ یہ اشاعت ٹھیک عشرۂ محرم
الحرام کے دن واقع ہو رہی ہے۔ پس میرا اشارہ حادثۂ ہائلہ کبریٰ کی
یعنی شہادت حضرت سید الشہداء علیہ و علی اجدادہ والصلوٰۃ والسلام کی
طرف ہے۔ عظم اللہ اجورنا بمصائبنا۔

وقت است کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی — سوز نفس نوحہ گر از تلخ نوائی
وقت است کہ آں پردگیاں گزرہ تعظیم — بے پردگی شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند — چوں شعلہ دخاں بر سر شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ فرسودۂ تشویش اسیری — دلہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہ رہائی
تنہا صف حسین ابن علی و صف اعدا — اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی

سچ یہ ہے کہ جن مردہ دلوں کو زندگی کے لئے سوز و تپش کی
ضرورت ہو جن ارباب درد کو روح کی راحت کے لئے غم کے
ماتم کی تلاش ہو جن کی زبان آہ و فغاں کی محبوب اور جن کی
آنکھیں خونبارہ فشانی کو اپنا مطلوب و مقصود سمجھتی ہوں ان کی [illegible]
ماتم و الم کی رونق کے لئے یہی افسانہ اتنا کچھ سامان غم اپنے اندر
رکھتا ہے کہ اگر خون کے بڑے بڑے سیلاب سمندروں کی روانی [illegible]
بہا دیں اور بے شمار لاشوں کی تڑپ [illegible] کے [illegible]
[illegible] جنبش میں آجائیں جب بھی اُن کا [illegible]

الہام سرائی سے قاصر رہے گی، جو اس کے ایک ایک نقطہ کے اندر سے توضیح فرمائے عبرت و بصیرت ہے۔

لیکن آہ کتنے دل ہیں جنھوں نے اس واقعہ کو اس کے حقیقی بصائر و معارف کے اندر دیکھا ہے؟ اور کتنی آنکھیں ہیں جو حسین ابن علی شہید پر گریہ و بکا کرتے ہوئے اُس اسوہ حسنہ کو بھی سامنے رکھتے ہیں، جو اس حادثۂ عظمیٰ کے اندر موجود ہے۔

فی الحقیقت حق و صداقت آزادی و حریت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان قربانی تھی جو صرف اس لئے ہوئی تاکہ پیروان اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے۔ اور اس طرح جہاد حق و عدالت اور اُس کے ثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لئے ایک کامل ترین مثال قائم کردے۔ پس جو بے خبر ہیں اُن کو رونا چاہیے۔ ان لم تبکوا فتباکوا! اور جو روتے ہیں اُن کو صرف رونے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے۔ اُن کے سامنے سید الشہداء نے اپنی قربانی کا ایک اسوہ حسنہ پیش کر دیا ہے۔ اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسین کی مدعی ہو، جب تک اسوہ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

ضرورت تھی کہ ایک مبسوط مقالہ افتتاحیہ "اسوہ حضرت سید الشہداء" کے عنوان سے کئی نمبروں میں لکھا جاتا اور نہایت تفصیل کے ساتھ اس حادثۂ عظیمۂ شہادت پر نظر ڈالی جاتی جس سے پہلے اس کی تاریخی حیثیت نمایاں کی جاتی اور اس کے بعد اُن تمام مواعظ و نتائج

عظیمہ کو ایک ایک کرکے بیان کیا جاتا جو اس ذبح عظیم کے اندر پوشیدہ ہیں، اور جن کی لسان حیات آج بھی اس طرح صدا دے رہی ہے جس طرح کنار فرات کی رتیلی سرزمین پر اب سے تیرہ سو برس پہلے زخم و خون کے اندر سے وعظ فرمائے حقیقت و صداقت تھی!!

دنیا میں ہر چیز مرجاتی ہے کہ فانی ہے، مگر خون شہادت کے اُن قطروں کے لئے جو اپنے اندر حیات الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں۔ کبھی بھی فنا نہیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

لیکن افسوس کہ شرح و بسط کے لئے اس وقت مستعد نہیں صرف چند مجمل اشارات پر اکتفا کروں گا۔

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

(۱) سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثۂ عظیمہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، دعوۃ الی الحق، اور حق و حریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرتا ہے۔

بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو، کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو غارت کیا اور شوریٰ و اجماع امت کی جگہ محض غلبۂ جابرانہ اور مکر و خدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظام حکومت شریعت الٰہیہ نہ تھا، بلکہ محض اغراض نفسانیہ و مقاصد سیاسیہ، ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی

اور حق و حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔

حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالم بنی امیہ کے خلاف جہاد حق کی بنیاد رکھی۔ اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پہ تھی، اُس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارت گر ہو اور جس کے احکام مستبدہ و جابرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پہ ہو۔

(۲) مقابلہ کے لئے یہ ضرور نہیں کہ تمھارے پاس قوت و شوکت مادی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس موجود ہو۔ کیونکہ حسین ابن علی کے ساتھ چند ضعفا و مساکین کی جمعیت قلیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج فکر سے بے پروا ہے۔ نتائج کا مرتب کرنا تمھارا کام نہیں۔ یہ اُس قوت قاہرہ عادلہ الہیہ کا کام ہے، جو حق کو باوجود ضعف و فقدان انصار کے کامیاب و فتحمند کرتی، اور ظلم کو باوجود کثرت و عظمت دنیوی کے نامراد و نگونسار کرتی ہے۔ وکم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔

ایسے موقعوں پہ ہمیشہ مصلحت اندیشوں کا خیال دامنگیر ہوتا ہے جو نفس اگرچہ عقل و دانائی کا ایک فرشتہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی شیطان رجیم بھی اُس کے بھیس میں آکر کام کرنے لگتا ہے۔

نفس خادع حیلہ تراشیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے تئیں شوا دینے اور چند انسانوں کا خون برباد دینے سے کیا حاصل؟ توپ و تفنگ اور حکومت و سلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں۔

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ تاریخ عالم کی صدہا امثال مقدسہ و محترمہ جہاد سے قطع نظر، تمھارے سامنے خود مظلوم کربلا کی مثال موجود ہے۔ تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے حکومتوں کی قوتوں اور ساز و سامان کا مقابلہ کب کیا ہے کہ کبھی کیا جائے؟ میں کہتا ہوں کہ حسین ابن علی نے صرف بہتر[۷۲] یا بہتر[۷۲] بھوکے پیاسے انسانوں کے ساتھ اُس عظیم الشان حکومت قاہر و جابر کا مقابلہ کیا جس کے حدود سلطنت ملتان اور سرحد فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور گو یہ سچ ہے کہ اُس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتے دیکھا اور پھر ایک ایک کرکے اُن میں سے ہر وجود مقدس خاک و خون میں تڑپا اور جان بحق تسلیم ہوا، اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دشمنوں سے نہ تو پینے کے لئے پانی چھین سکا، اور نہ زندہ رہنے کے لئے اپنی غذا حاصل کر سکا، اور اس میں بھی شک نہیں کہ بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں سے چور ہوا اور اس خلعت شہادت لالہ گون سے آراستہ ہو کر طیارہ ہوا، تا اُس کرشمہ ساز عجائب کے حریم وصال میں پہنچے، جو دوستوں کو خاک و خون میں تڑپاتا، اور دشمنوں کو سلطنت دیتا ہے۔

اس کے وصال کو یزید قتلی!

تاہم فتح اُس کی تھی، اور فیروزمندی و کامرانی کا تاج صرف اُسی کے زخم خوردہ سر پہ رکھا جاچکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا۔ پہا پنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالم اضطراب میں اس کے زخموں سے ریگ و سنگ پہ بہتا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلابہائے آتشیں پیدا کر دئے۔ جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی، نہ حجاج کی بے اماں خونخواری اور نہ عبدالملک کی تدبیر و سیاست۔ وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان کی ایک ایک چنگاری کو آتشکدۂ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آگیا۔ اور جو کچھ سنہ ۶۱ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا۔ وہ سب کچھ سنہ ۱۳۲ھ میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالم اسلامی کے اندر ہوا۔ صاحبان تاج و تخت خاک و خون میں تڑپے، ان کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں۔ فتح مندوں نے قبریں تک اکھاڑ ڈالیں، اور مردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا۔ اور اس طرح وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون کا پورا پورا ظہور ہوا۔

پھر کیا یہ سب جو کچھ ہوا، وہ محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابومسلم خراسانی کی ریشہ دوانیوں کا ہی نتیجہ تھا؟ کیا یہ اُسی خون کا اعجاز نہ تھا جو فرات کے کنارے بہایا گیا تھا؟ پھر یہ فتحمندی تو عجب ظاہر ہے جس کے نتائج کے لئے ایک صدی کا انتظار کرنا۔ ورنہ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے۔ اسی وقت اپنی معنوی فتحمندی حاصل کر لیتا ہے۔

(۳) بہر حال یہ تو حق و صداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں۔ جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن حضرت سیدالشہداء کا اُسوۂ حسنہ بتلاتا ہے کہ تم اِن نتائج کی ذرا بھی پرواہ نہ کرو۔ اگر ظلم اور جابرانہ حکومت کی بنیاد ہے تو اُس کے لئے حق کی قربانی ناگزیر ہے اور اُسے ہونا ہی چاہیئے۔ تعداد کی قلت و کثرت یا سامان و وسائل کا فقدان۔ اِس پر مؤثر نہیں ہو سکتا۔ اور ظلم کا صاحب و شوکت و عظمت ہونا اس کے لیے کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اُس کی اطاعت ہی کرنی چاہیئے۔ ظلم خواہ ضعیف ہو خواہ قوی، بہر حال میں اُس کا مقابلہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ظلم ہے۔ اور حق و صداقت ہر حال میں یکساں اور غیر متزلزل ہے۔

(۴) حق و عدالت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب ربا ہیں۔ قدم قدم پر حفظِ جان و ناموس اور محبت فرزند و عیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں لیکن یہ اُسوۂ حسنہ مومنین مخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب و ہمت کو اچھی طرح آزمالیں۔ نہ کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر کھا گئے۔

جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست

اس قبیل جادۂ حق و صداقت کے چاروں طرف جو کچھ تھا۔ اس کا اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی آزمائشوں کے متعدد درجے بیان کئے ہیں:۔

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات، وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم

مصیبۃ، قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون (۲-۱۵۲)

"اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائشوں میں ڈالے گا۔ وہ حالت خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان جان و مال اور ہلاکت اولاد و اقارب میں مبتلا کرکے تمہارے صبر و استقامت کو آزمائے گا، پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے اُن کے لئے، جن کے ثبات و استقامت کا یہ حال ہے کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے تمام معاملات کو یکسر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ :- انا للہ و انا الیہ راجعون"

خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان اموال و متاع، قتل نفس و اولاد یہ چیزیں انسان کے لیے اس دنیا میں انتہائی مصیبتیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ان ہی چیزوں کو راہ الٰہی کے لئے آزمائش قرار دیا گیا۔

لیکن مظلوم کربلا کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کرکے موجود تھے وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پاکر آرام و راحت اور شوکت و عظمت حاصل کر سکتا تھا۔ اگر حکومت ظالمہ کی وفاداری و اطاعت کا عہد کر لیتا اور حق و صداقت سے روگردانی کے لئے مصلحت وقت کی تاویل پر عمل کرتا۔ پر اُس نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی، اور حق کا عشق، زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا۔ اُس نے اپنا سر دے دیا کہ اُس کے پاس حق کے لئے یہی ایک آخری متاع ہے، پر اطاعت و اقرار وفاداری کا ہاتھ نہ دیا جو صرف حق و عدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا۔ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ

واللہ رؤف بالعباد

(۵) سب سے بڑا اسوۂ حسنہ کہ اس حادثۂ عظیمہ کی لسان حال اس کی ترجمانی کرتی ہے۔ راہ مصائب و جہاد حق میں صبر و استقامت اور عزم و ثبات ہے کہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا
دوسری جگہ کہا۔ فاستقم کما امرت یا رسول اللہ و من تاب۔

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ — آنجا کہ لطمہ ہائے بلا بشدّت زنند

فی الحقیقت اس شہادۂ عظیمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے تمام عزیز و اقارب اہل و عیال اور فرزند و احباب کے ساتھ دشت غربت و مصائب میں محصور اور جدا ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدت عطش و جوع سے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھنا، پھر ان میں سے ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھ سے اٹھانا، حتیٰ کہ اپنے طفل شیر خوار کو بھی تیر ظلم و بربریت سے نخچیر پاتا۔ مگر با ایں ہمہ راہ عشق صداقت میں جو پیمان صبر و استقامت باندھا تھا، اس کا ایک لمحہ کیا ایک عشر دقیقہ کے لئے بھی متزلزل نہ ہونا اور حق کی راہ میں جس قدر مصائب و آلام پیش آئیں سب کو شکر و منت کے ساتھ برداشت کرنا کہ۔ رضینا بقضاء اللہ و صبرنا علی بلائہ۔

پیکان ترا بجاں خریدار
ست مرہم دیگراں نخواہم

دوست کے ہاتھ سے جام زہر بھی ملتا ہے تو تشنہ کامان زلال محبت اسے عیزوں کے جام شہد و شکر پر ترجیح دیتے ہیں۔

اے جفا ہائے تو خوشتر از وفائے دیگراں

آج بھی اگر گوشِ حقیقت نیوش یا زہو تو خاکِ کربلا کا ایک ایک ذرہ توصیہ فرمائے صبر و استقامت ہے۔

شدیم خاک و لیکن بوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردی خیزد

بانگِ درا

اقبال اسوقت اردو کے سب سے مقبول اور اعلیٰ شاعر ہیں۔ ان کا کلام اب تک متفرق تھا اور ایک جا جمع ہو کر شائع نہیں ہوا تھا۔ ان کے کلام کے دلدادہ اس سے مطمئن نہ تھے اور ایک مدت سے منتظر اور مشتاق تھے کہ سارا مجموعہ کتاب کی صورت میں شائع ہو جائے کس قدر مسرت کی بات ہے کہ وہ آبدار موتی جو اب تک بکھرے ہوئے تھے ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی جوت سے آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔ کتاب کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑتی ہے "ہمالہ" ہے۔ کوہ ہمالیہ ہندوستان کی شوکت و شان کا نشان اور اس کے حفظ و امن کا پاسبان ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے

جس شاعری کی ابتدا کوہ ہمالہ ہو اس کی انتہا کیا ہوگی۔ میں اقبال کے لئے اس میں نیک شگون پاتا ہوں وہ محاسن جو بعد میں ہم نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اقبال کے کلام میں نکالے اُن سب کے نمونے اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ تخیل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں۔ لیکن سب سے بڑی بات جو ہم اس میں دیکھتے ہیں اور جو اپنا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حب وطن کی بو آتی ہے اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بھی بڑھتی جاتی ہے۔ چند ہی صفحوں کے بعد صدائے درد کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم ہے، شاعر درد دل سے چیخ اُٹھتا ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اس کے پیچھے ہی ہندوؤں کے مقدس منتر گایتری کا ترجمہ ہے جو اس قدر پاک خیال کیا جاتا ہے کہ غیر برہمن کے کان میں اس کی آواز تک پہنچنا ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ گویا جس اخوت کی انھیں تلاش تھی۔ اس کے لئے پھولوں کا ایک ہار گوندھا ہے۔ چند نظموں کے بعد سید کی لوح تربت ہے جس میں یہ ہدایت درج ہے۔

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

اس سے ذرا آگے ایک اور نظم "تصویر درد" آئی ہے جو درحقیقت بے مثل اور سراپا درد ہے اور شاعر نے دل کھول کر اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے:-

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا مجھ کو
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ گلچیں میں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے
اسی نظم کے ایک بند میں کس حسرت سے یہ شعر کہا ہے ؎
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
اور کیا خوب کہا ہے ؎
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا
اس نظم میں ایک شعر ہے جو ملک کی اس وقت کی حالت کا صحیح نقشہ ہے ؎
تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
چند ہی ورق لوٹنے کے بعد ترانۂ ہندی آتا ہے جسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے جو شاید ہی کسی دوسری نظم کو حاصل ہوئی ہو اور وہ گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے، عام و خاص، عالم و جاہل سب کی زبان پر جاری تھا، اس کا ایک ایک لفظ حبِ وطن میں ڈوبا ہوا ہے۔
اس کے بعد ہی "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہے جو وطن کی محبت کا راگ ہے۔ اور جس کا پانچواں مصرعہ یہ ہے "میرا وطن

ہے، میرا وطن وہی ہے ۔" یہ گیت ختم ہوتے ہی ایک اور نظم آتی ہے
جس کا نام "نیا شوالہ ہے" یہ شاعر کے انتہائی کمال کا نمونہ ہے ۔
اس کے ہر شعر میں حب وطن کی آگ بھری ہوئی ہے ۔ یہ وہ نظم
ہے جو ہر انجمن اور ہر کانگریس کے ہال میں سونے کے حروف سے
لکھے جانے کے قابل ہے اور ان کے اسٹیجوں پر بجائے بدنما کرسیوں
اور میزوں اور مہمل اور بے معنی آرائش کے نیا شوالہ کی تعمیر ہونی چاہیئے
جہاں پہ پرستاران وطن کا سر جھک جائے اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت
اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو۔ اس نور کی جھلک ہر مذہب میں پائی جاتی
ہے، لیکن اس کی تکمیل کسی نے نہیں کی ۔ ہر زمانے میں ایسے پاک نفس
اور نفس پرست لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اتحاد و محبت کا بیج بونا
چاہا لیکن ان کی کوششیں گھٹ کر ایک فرقے میں محدود رہ گئیں ۔
شاعر ان تمام فرقہ سازیوں اور فرقہ بازیوں کو مٹانا چاہتا ہے ۔ ہر
انسان جو تعصبات اور روایات کے گرد و غبار سے الگ ہو کر
انصاف کے ساتھ غور کرے گا ۔ تو اُسے وہ حقیقت نظر آئے گی ۔
جہاں شاعر کی نظر پہنچی ہے ۔ لیکن تعصبات پھر غالب آجاتے ہیں
اور آئینہ کو مکدر کر دیتے ہیں ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جہاں شاعر
پہنچا ہے ۔ وہاں تک کوئی اور نہیں پہنچا ۔ بے شک بعض لوگ وہاں
تک پہنچے ہوں گے ۔ لیکن انھیں اظہار حق کی توفیق نہیں ہوئی ۔ اقبال
نے اس حقیقت کو بلا خوف ملامت ظاہر کر دیا ۔ لیکن اس پر قائم
کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے، ہم اس وقت جو جتن ملک میں
محبت اور اتحاد قائم کرنے کے لئے کر رہے ہیں وہ سب ادھوری

اور عارضی ہیں۔ حقیقت سے دور اور حق سے نا آشنا ہیں، وحدانیت اور اتحاد کا راز نئے شوالے ہی میں ہے۔
نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی شاعری کا پہلا دور ختم ہوتا ہے اس دور کا نام میں نے حبِ وطن رکھا ہے۔ دوسرے دور کا آغاز اس مجموعے کے دوسرے حصے سے ہوتا ہے، جسے میں نے حبِ ملت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کی ابتدا ۱۹۰۵ء سے ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ انگلستان تشریف لے گئے ہیں۔ انگلستان ہمارے نوجوانوں کی کسوٹی ہے، ان کے اصل جوہر وہاں جا کر کھلتے ہیں ان کے لئے وہ ایک نیا عالم ہوتا ہے، جدید تمدن کی روشنی بعض اوقات ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب سنبھلتے ہیں تو اپنے امتحانوں کے دھندے میں لگ جاتے ہیں اور اس سے جو وقت بچتا ہے وہ نئے لطف اندوزیوں میں بسر ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں وطن کی لو لگی ہوتی ہے۔ وہ طرح طرح کے منصوبے گڑھتے اور وطن کی خدمت کے لئے نئے نئے خیالات سوچتے ہیں۔ بعض تو نہر سویز تک پہنچتے پہنچتے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، اور کچھ ثابت قدم رہتے ہیں۔ شروع شروع میں یہاں آ کر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن وہ چنگاری جو سات سمندر طے کر کے سلگتی ہوئی آئی تھی، گرد و پیش اور صحبتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ کچھ کے خاک ہو جاتی ہے، البتہ ہی کا دکا ایسا نکل آتا ہے جو باوجود موانعات کے کام کرتا رہتا ہے اور کچھ کر گزرتا ہے گو کتنے سو وہ امتحانوں کے لئے انگلستان جاتے ہیں، لیکن اصل امتحان ان کا

ہندوستان میں ہوتا ہے جس میں اکثر بیٹے نکلتے ہیں۔ اس کا دوش تنہا شخص پر نہیں بلکہ ہمارے ملک کی حالت تعلیم کا طریقہ گھروں کی صحبت، انتخاب کی غلطی اور اسی قسم کے اور اسباب بھی اس کے ذمہ دار ہیں اور ان کو الزام دینا ہی غلطی ہے وہ نہ اس خیال سے جاتے ہیں اور نہ ان خیالات کو لے کر آتے ہیں۔ وہ جس غرض سے جاتے ہیں اُسے کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتے ہیں لیکن اقبال کا جانا اس عام گلے کا جانا نہ تھا جو ہر سال یہاں سے جہاز بھر کر دیارِ مغرب کو جاتا ہے وہ ایسے وقت گئے تھے جب کہ اُن کی طبیعت اور سیرت میں پختگی آچکی تھی۔ ملک کی حالت سے واقف اور زمانے کے تیور پہچان چکے تھے حبِّ وطن کی لو لگی ہوئی تھی ملک میں ان کا کلام مقبول ہو چکا تھا۔ اور اقبال کا ترانہ اور وطن کے گیت دیس کے گلی کوچوں میں گائے جا رہے تھے۔ یورپ میں ان کی آنکھوں نے کیا کیا تماشے دیکھے۔ کیا کیا خیالات دل میں موجزن ہوئے۔ کیسے کیسے منصوبے سوچے کیا کیا سامان اپنے ملک کے لئے جمع کئے، کیسے کیسے ارادے تھے جو دل ہی دل میں رہ گئے۔ یادِ وطن نے کس کس طرح بے قرار رکھا اور اپنی پستی کو دیکھ کر دل پر کیا کیا صدمے گزرے اور اس کے ابھارنے کے لئے کیا کیا ولولے پیدا ہوئے؟ ان کا جواب یا تو وہ خود دے سکتے ہیں، یا ان کا کوئی رازدار دوست ولیکن اس زمانے کے کلام کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نئے مشاہدات اور خیالات نے اُن کے دل میں ایک جوش اور تلاطم پیدا کر رکھا ہے جن کے اظہار کے لئے وہ بیتاب اور مجبور ہیں۔

ان خیالات کو اُنھوں نے اِس نظم میں موزوں کیا ہے جو شیخ عبدالقادر صاحب کے نام ہے، جو یورپ میں اُن کے ہم سفر، ہم مشرب وہم راز تھے۔ یہ گویا اُن کی آئندہ زندگی کا پروگرام ہے جس پر وہ خود عامل ہونا چاہتے ہیں، اور دوسرے کو عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں، اس خط کے یہ دو شعر اُن کے درد دل کو ظاہر کرتے ہیں ؎

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

انگلستان کے قیام کے زمانے اور اُس کے بعد کے کلام سے دو باتیں خاص طور پر معلوم ہوتی ہیں جنھوں نے ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا ہے، ایک تو یہ کہ یورپ کے جدید تمدن کا طلسم ان کی نظروں میں مکڑی کے جالے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، جو محض خود غرضی اور خود پرستی پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کے حق میں سم قاتل ہے۔ اس پر انھوں نے بڑی بڑی کاری ضربیں لگائی ہیں۔ اُن کے یہ شعر مشہور اور زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

دوسرے وہ یورپ کی وطنیت اور قومیت سے جس کا اثر تمام یورپ پر

اور دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پھیلتا جاتا ہے، سخت بیزار ہیں۔ وہ اس تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لئے باعث ہلاکت اور موجب ہلاکت خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی جنگ عظیم سے جو بربادی یورپ اور عام طور پر دنیا پر نازل ہوئی، اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ اس بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی اخوت و مساوات کی طرف مائل ہوتے ہیں، اور یورپ کی معاشرتی اور معاشی اور سیاسی زندگی جو بے روح اور صداقت سے خالی ہے، انھیں اس عقیدے پر اور مستحکم کر دیتی ہے۔ اس طوفان سرمایہ داری اور استبداد میں انھیں ایک ہی روشنی نظر آتی ہے، جو دنیا کو نجات دے سکتی ہے اور جو جغرافیائی حدود اور نسل و رنگ کے قیود سے بالا ہے۔

تھا الا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اسی خیال کو دوسرے انداز سے بیان کرتے ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور اسی وجہ سے وہ ہندوستان کی ان کوششوں کو جو ملک کے محبت وطن اتحاد پیدا کرنے کے لئے کر رہے ہیں، مسلمانوں کے حق میں ایسی ہی ہیچ پوچ سمجھتے ہیں، جیسے مجلس اقوام، لیگ آف نیشنز کی کوششیں انجام عام کے لئے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "ترانۂ ہندی" کے جواب میں

"ترانۂ ملی" لکھ کر اس کے اثر کو کم کرنا چاہا جو ان کے اختیار سے باہر تھا۔ اس کے بعد وطنیت کی نظم میں کھلم کھلا اپنے عقیدے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس تازہ آفت سے بچنے کی ہدایت کی ہے کہ وطن پرستی بھی بت پرستی ہے ؎

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس کے بعد کہتے ہیں ؎

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے — غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ ان خیالات کو بار بار اس سے زیادہ جوش اور حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور سیاسی وطن کو اصول اسلام کے خلاف بتلاتے

ہیں، ان نظروں میں قرون اولیٰ کا سماں سمایا ہوا ہے، وہ وہی سادگی، حمیت ایثار اور اخوت چاہتے ہیں کہ مسلم اپنی قدر اور اسلام کی حقیقت سمجھے، وہ فخر کائنات ہے اور یہ ترانہ جو صداقت سے بیگانہ ہے ان اصولوں کا منظر ہے جو اسلام کی تعلیم میں نہاں ہے ؎

دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا — حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا

میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے — میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

وہ نصاریٰ وضع اور ہنود سیرت مسلمان کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ وہ مغربی تہذیب اور اس کی رعنائیوں منافقت اور خود فروشی، اس کی جمہوریت میں استبداد، اس کے آئین میں قیصریت دیکھتے ہیں اشاعت تعلیم و تہذیب کے دعوے۔ اصلاح و تنظیم کی مجلسیں، حقوق و مراعات کی قراردادیں دھوکے کی ٹٹیاں ہیں۔ جن کی آڑ میں مغرب کا فرمانروا اقوام عالم کا شکار کھیلتا ہے، لیکن یہ سب تدبیریں اور حکومتیں ناپائدار ہیں عنقریب مٹنے والی ہیں، دنیا بہت جلد ان سے تنگ آجائے گی، اور بری طرح انتقام لے گی، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس رمز کو سمجھ جائیں، آنے والے دن کے لئے ابھی سے تیار ہو جائیں، ان میں پھر وہی پہلی سی اسلامی حرارت پیدا ہو، وہی ولولے، وہی مساوات اور اخوت ہو، ان کی منتشر جمعیتیں ایک شیرازے میں بندھ جائیں، مختلف فرقے اور مختلف اسلامی دولتیں ایک ہو جائیں، تاکہ وہ دنیا کی رہنمائی کر سکیں۔ دنیا اپنی حالت سے بیزار اور اپنے آئین سے تنگ آگئی ہے، وہ خودکشی پر آمادہ معلوم ہوتی ہیں، ایسی حالت میں اگر کوئی آڑے ہو سکتا ہے، تو وہ اسلام ہے، کیونکہ دنیا ایسے

نظام کی منتظر ہے جو سرمایہ داری سے پاک ہو جس میں حاکم و محکومیت کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ جس کا خدا ایک جس کا آئین ایک جس کا خیال ایک اور جس کا مطمح نظر ایک ہو اور جو شروع سے آخر تک توحید ہی توحید ہو، اور کہیں دوئی کا نام نہ ہو، ایسا نظام سوائے اسلام کے اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب کہ اسلام کا بول بالا ہوگا۔ دنیا کی اقوام اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گی۔ اس کی پاک تعلیم سے پرانا ناسور مندمل ہوگا۔ امن و امان اور اخوت و مساوات کا دور ہوگا۔ اس وقت سچا مسلم اقوام عالم کا امام اور اس جہان کا خلیفہ ہوگا۔ یہ ہے وہ آرزو جو ہمارے شاعر کے دل میں موجزن ہے اور جس پر اس نے فلسفہ اور شاعری کی ساری قوت صرف کر دی ہے۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے تا بخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کے مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

ایک چھوٹی سی نظم تین بیتوں کی مذہب پر لکھی ہے جو یہ ہے :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ملت نہ وطنیت پر
ہے، نہ قومیت و نسل پر بلکہ مذہب پر۔ اس کی قوت اور اتحاد
سیاست یا قانون پر نہیں بلکہ دین پر، مذہب ان کے شیرازۂ اتحاد
کو جو اب ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ مضبوط کرے گا، اسی کی بدولت سب
مختلف اور منتشر قومیں ایک جا ہوں گی اور اسلامی ملت ایشیا
کی نہیں سارے عالم کی رہنما اور امام ہوگی، ایک نئے دور کا آغاز
ہوگا۔ اور سرمایہ داری اور استبداد سیاست اور رقابت کا خاتمہ
ہو جائے گا۔ یہ ہے اقبال کا خواب جس کی تعبیر پہ وہ فدا ہیں ہے۔
اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دوسرے مذاہب یا اقوام سے نفرت کرتا
ہے، یا اُن سے تعصب رکھتا ہے، نہیں بلکہ اُس نے رام "نانک"
سوامی، تیرتھ رام پر بھی ایسی ہی سچائی اور جوش سے نظمیں لکھی ہیں
جیسے اپنے پاک نفس بزرگوں کے لئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے

غور و فکر اور تجربہ کے بعد اس نکتے پر پہنچے ہیں، کہ دنیا کی اقوام کی
یک جہتی کی بنیاد سوائے ملت اسلام کے کسی قوم کو دنیا کی خلافت
کا اہل نہیں سمجھتے۔ انھوں نے جو کچھ اس بارے میں لکھا ہے، اس
کا ایک ایک لفظ خلوص صداقت اور جوش سے بھرا ہوا ہے۔ وہ عاشق
شیدائے اسلام ہے اور عاشق کو ہر جرم معاف ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ آخر آخر میں اُن کا میلان طبع فارسی کی طرف
زیادہ ہوتا گیا تاکہ اس کے ذریعے سے اپنے خیالات آسانی سے ممالک اسلام
میں شائع کر سکیں اور ملت اسلام کو ایک جمعیت بنانے میں مدد دے سکیں۔
کیونکہ جب اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو شاعر کی درد بھری آواز لوگوں
کے مردہ دلوں میں کھولن پیدا کرتی ہے اور انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ہوتی
ہے۔ جناب شیخ عبدالقادر صاحب نے اس مجموعے کے شروع میں ایک
پرلطف دیباچہ لکھا ہے جو صرف شیخ صاحب ہی لکھ سکتے تھے۔ اس میں
انھوں نے اقبال کے کلام پر تنقید نہیں کی۔ بلکہ اُن کی شاعری کا نشو و
نما اور تدریجی ترقی دکھائی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے اس میں فرماتے
ہیں۔ دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا
یعنی اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعہ
خیال بنا لیا۔ اس کے لئے شیخ صاحب نے کئی اسباب بتائے ہیں جنھیں
میں اُنھیں کے الفاظ میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔

فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب
سے پیدا ہوئی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب حالات
تصوف کے متعلق لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی اُس کو بھی ضرور اس تغیر

مذاق میں دخل ہو گا۔ اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے
متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں
نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور
فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے
ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔ اس لئے
وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے مگر لطف یہ ہے کہ جس چھوٹے سے موقع سے
ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک
دوست کے یہاں مدعو تھے۔ جہاں اُن سے فارسی اشعار سنانے
کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں،
انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ انھوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے
فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش
نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر
پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور
صبح اُٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں
جو انھوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی
فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔ جس کا پہلے انھوں نے اس
طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر
گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں کہتے تھے مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف
ہو گیا۔"

شیخ صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں جائے دم زدن نہیں
بےشک یہی اسباب فارسی کی طرف ان کے میلان طبع کے ہوئے ہونگے۔

لیکن جس چیز نے مستقل طور پر فارسی میں کہنے کی طرف مائل کیا وہ وہی خیال ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، یعنی ملت اسلام کے افتراق و نفاق کو دور کر کے اسے ایک قومی جمعیت بنانا جس کی بنیاد خالص اسلام پر ہو، اسے کاہلی اور نکبت سے نکال کر عمل اور جد و جہد کی طرف مائل کرنا۔ اہل ملت میں وہ سیرت اور خلوص پیدا کرنا کہ ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے ہاتھ میں شمع ہدایت ہو اور بالآخر انھیں اقوام عالم کی سرداری اور امامت کے لئے آمادہ کرنا۔ یہ تعلیم اُن کی تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ خواہ وہ کسی ملک اور نسل کے ہوں۔

لیکن ہند کے مسلمان عجیب کشمکش میں ہیں، جب حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی، اور وہ نشۂ دولت سے ذرا ہوشیار ہوئے تو تو ہادی نے انھیں یہ ہدایت کی کہ دل اسلام سے تعلق یا محبت رکھنا خلاف مصلحت ہے، اُدھر اہل وطن سے یک جہتی دشوار ہے کیونکہ وہ تعداد میں زیادہ اور ہم کم ہیں۔ اگر رہے تو اُن کے تابع ہو کے رہنا پڑے گا۔ پس ایک ہی صورت ہے کہ انگریزوں سے ملک میں مل کر رہو۔ اسی میں تمھاری خیر اور تمھاری زندگی ہے، ایک مدت اسی پر کاربند رہے لیکن سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں، یہ طلسم بھی ٹوٹ کے رہا۔ اس کے بعد رموز سیاست کے شناسا اور زمانے کے نباض آئے اور ہدایت فرمائی کہ اگر ہمیں عزت کے ساتھ زندہ سلامت رہنا ہے تو اہل وطن سے یک جہتی اور اتحاد پیدا کریں، ورنہ ملک ہمیشہ پامال رہے گا۔ اور ملک والے کبھی غلامی سے نہ نکل سکیں گے، سارے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک صلح و آشتی کی لہر دوڑنے لگی، اتحاد

و اتفاق کے ترانے گائے جانے لگے اور لوگوں کے سینے صلحکاری اور محبت
کے نور سے معمور نظر آنے لگے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک مدت کے بعد گویا
اس ملک پر خدا کی رحمت نازل ہونے والی ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی تلقین تھی
کہ اگرچہ حب وطن ایمان ہے لیکن اسلامی ریاستوں سے محبت و ہمدردی
کا تعلق نہ ٹوٹنے پائے ہندوؤں نے بھی اسے تسلیم کیا اور عالی ظرفی سے ساتھ
دیا، دونوں بچھڑے بھائی پھر مل گئے اور اخلاص و محبت سے رہنے
لگے۔ نہ معلوم کس کی نظر لگ گئی کہ پھر پھوٹ پڑ گئی اور چار دن کی چاندنی کے
بعد پھر اندھیرا گھٹا ٹوپ ہو گیا۔ خدا ان بزرگوں کی ہمت میں برکت دے، جو اب
تک اس اتحاد کے پیدا کرنے میں سچے دل سے ساعی ہیں۔ اب ہندو اپنی تنظیم
الگ کر رہے ہیں اور مسلمان الگ فکر میں ہیں کہ اپنی جمعیت درست کریں،
بہرحال کچھ دنوں کے لئے یہ کھکھیڑ ان کی قسمت میں اور لکھی ہے، ٹھوکریں
کھا کر ایک دن رستے پر آ ہی جائیں گے۔

یہ سیاست دانوں اور ملک کے رہنماؤں کی تدبیریں تھیں، شاعر اور حکیم
کی صدا ان سے نرالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے وطنیت کا خیال ہیچ در ہیچ
ہے۔ سیاست ایک قسم کی عیاری ہے، تہذیب و آئین مغربی غول راہ ہیں،
اس لئے انھیں چاہئے کہ وہ ان پھندوں میں نہ پھنسیں۔ وہ مذہب کو رشتۂ
اتحاد بنائیں، وہ خصائل اخلاص پیدا کریں، جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھے
اور ان اصولوں پر کاربند ہوں جو تیرہ صدی پہلے انھیں دئے گئے تھے اور اس
پاک تعلیم کے ذریعے ایشیائی رہبری کریں، اور پھر ایک بار عالم پر چھا جائیں، کیونکہ
دنیا کی نجات اسی میں ہے۔ یہ ہے اقبال کا پیام ملت اسلام کے نام، اور ۱۹۰۵ء
کے بعد سے اسی آواز میں زیادہ گونج اور قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ ہیئت اعلیٰ

خیال ہے اور مسلمانوں کے لئے بہت خوش آیند ہے لیکن
ڈر ہے کہ کہیں اس کی شدت ہمیں ہندوستان سے غافل نہ کر دے۔ ہندوستان
کے مسلمانوں کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے جو دلی محبت ہے۔ اس کے لئے
کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہم اسے جنگ بلقان اور خلافت کے معاملے میں خوب
دیکھ چکے ہیں، کیا اُن کو بھی ہندی مسلمانوں سے ایسی ہی محبت ہے، ہندی
ہر خطے میں حقیر سمجھا جاتا ہے، اور غلام سے زیادہ اس کی وقعت نہیں۔ ہندی
مسلمانوں کی خود اسلامی ممالک میں کوئی وقعت نہیں، جب تک ہم اس ملک میں
جہاں رہتے ہیں اپنی حیثیت مضبوط نہ کر لیں اور جب تک ہم یہاں آزادی
خیال اور آزادی عمل کو حاصل نہ کریں، ملی اتحاد کا خیال خواب ہی خواب
ہے۔ اگر مسلمان ملک کے دوسرے باشندوں کے دوش بدوش ملکی اتحاد
و ترقی میں جدوجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو انھیں اس ملک میں رہنے کا
کیا حق ہے؟ وہ لوگ کیا دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں جو بے اجازت اپنے
ملک سے قدم باہر نہیں رکھ سکتے، اور جو بے اذن کسی عملی ہمدردی کے
قابل نہیں ہیں، جب ہم اپنے ہی ملک میں بیگانہ اور آپس کے تفرقوں کے
شکار ہیں تو دوسروں کے سامنے کس منہ سے اتحاد کی تعلیم پیش کریں۔

تاہم اقبال کے پیام میں بلندی اور ایسا خلوص اور جوش ہے کہ وہ رائگاں
نہیں جا سکتا۔ وہ سوتوں کو جگاتا ہے، غافل قلوب کو ہوشیار کرنے اور دلوں کے
ابھارنے میں بجلی کا سا کام کرے گا۔ اس کا مقصد سیاست یا ملک گیری نہیں
بلکہ وہ اخلاقی اور روحانی ہے جس کی بنیاد اسلامی تعلیم پر ہے اور جس کی غرض
اسلامی اصول اور آئین کی اشاعت ہے، جو اتحاد ملی کے ذریعے سے دنیا پر
کارفرمائی کر سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی انھیں اپنے "ترانہ ہندی" کو بالکل بھلا نہیں

دیا جاتا ہے۔

وہ خود فرماتے ہیں ؎

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

مگر افسوس کہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا جاتا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں صرف عجمی خم اور حجازی بادہ ہی رہ جائے اور اس خیال کی تصدیق مجھے اس شعر سے ہوئی جو نیر کا کہا ہوا ہے۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

لیکن اگر ایسا ہوا تو غضب ہو جائے گا۔ اس لئے ہم اس درخواست میں شیخ عبدالقادر صاحب کے ساتھ شریک ہیں کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق ہے خود انھوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں۔ جن میں ایک شعر میں اردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

ہم ان کا یہ شعر پڑھ کر ان سے یہ کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر ان سے لکھوایا تھا۔ اس سے کام لے کر اب وہ پھر کچھ عرصہ کے لئے گیسوئے اردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسی نہیں کہ اردو ان کے خیالات سے محروم رہ جائے گی بلکہ ان کا پیام جسے وہ اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے ہیں تشنہ اور اثر سے محروم رہ جائے گا۔

اقبال کی شاعری یا اُن کے پیام پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ہمیں قدامت پرستی کی طرف مائل کرتی ہے اور بجائے آگے قدم بڑھانے کے وہ ہمیں صدیوں پیچھے لے جانا چاہتی ہے۔ لیکن ان کو اس کی مطلق پرواہ نہیں بلکہ اس پر نازاں ہیں اور ایک گونہ فخر کے ساتھ خود ان الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں ؎

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

لیکن ان کی قدامت پسندی مردہ نہیں ہے جو دلوں میں یاس اور اُداسی پیدا کرتی ہے بلکہ وہ ان اصول کی پیروی ہے جن کی صداقت پر شاعر کو کامل یقین ہے۔ وہ اپنے پیام عہد ماضی کی روشن مثال دکھا کر بار بار انھیں عمل اور جد و جہد اور ثبات پر آمادہ کرتا ہے ؎

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اسی خیال کو دوسری جگہ ادا کیا ہے ۔

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے

یہی خیال شعر میں بھی ہے ۔

مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو
زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار ہے

کوشش ناتمام کے متعلق کہتے ہیں ؎

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اس سے بڑھ کر کوئی کیا کہہ سکتا ہے ؎

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا — مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو — خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو
بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے — تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبال کی شاعری کی پوری حقیقت معلوم کرنے کے لئے شمع اور شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام کی نظمیں غور سے پڑھنی چاہئیں۔ یہ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی دوسری نظمیں اس پایہ کی نہیں ہیں ان کی بعض چھوٹی نظمیں بہت پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ مثلاً ایک آرزو سرگذشت آدم۔ جگنو۔ چاند۔ صبح کا ستارہ، پرندہ اور جگنو وغیرہ بہت اچھی نظمیں ہیں لیکن جن تین نظموں کا میں نے نام لیا ہے وہ ایسی ہیں کہ ان میں اقبال کی شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

تخیل کی بلندی۔ تشبیہات و استعارات، لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ مرزا کے معنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوق سخن ہے۔ بآسانی اسے سمجھ سکتا ہے لیکن بندش میں وہ چستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرز ادا یا

جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی اور نہ وہ سوز و گداز اور درد ہے جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں، مگر شان و شکوہ، زور اور شور امنڈتے ہیں، جذبات کی ادائی، حکیمانہ نظر اور شاعرانہ انداز بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

گویا ہزار ہا سال کے تاریخی تجربوں کے نچوڑ کو دو مصرعوں میں پیش کر دیا ہے۔ شاعروں نے بہار و خزاں کے [illegible] اور گل و بلبل کے راز و نیاز بیان کئے ہیں۔

اقبال نے صحرا کا سماں لکھا ہے، چند شعر ہیں مگر کس قدر بلند اور کیفیت پیدا کرنے والے:۔

اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل
وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر قیام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کی تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

یا اس شعر کو دیکھیے کیا خیال ہے اور کیا قوت بیان :۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

میرا مقصد اس وقت اقبال کے منتخب اشعار کا پیش کرنا نہیں ہے اور نہ یہ اس کا موقع ہے اور نہ مسلسل نظموں میں سے بعض اشعار کا انتخاب مناسب ہے۔ جسے ان کے کلام کا لطف حاصل کرنا ہو، وہ کم سے کم ان کی وہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

آج کل بعض سخن سنج اقبال کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور فخر ہندوستان شاعر ٹیگور کے کلام سے کرتے ہیں۔ ٹیگور کے کلام میں بے شک پریم کا رس گھلا ہوا ہے، اس کی محبت عالمگیر ہے۔ وہ کائنات کو اپنے آغوش محبت میں لینا چاہتا ہے۔ اس کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے، لیکن اس میں وہ آگ نہیں جو اقبال میں ہے۔ ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن۔ ٹیگور کا جذبۂ محبت گو بہت گہرا اور بے تھاہ ہے۔ لیکن وہ اپنے حدود توڑ کر کبھی آگے نہیں نکل جاتا، اور یا وجود کیف و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبال کا مطمح نظر اگرچہ مقابلۃً محدود ہے مگر زیادہ قومی زیادہ پر زور اور زیادہ شور انگیز ہے۔ ٹیگور کے ہاں نازکی ہے

نازک موقع پر بھی عقل کی پرچھائیں اُس کے پاس ضرور نظر آتی ہے، مگر یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بیچاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لیے اُچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہیں، وہاں خوبی و کیفیت کے ساتھ خودداری ہے اور یہاں وارفتگی و شگفتگی۔

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

لیکن اگر وہ ایک لحظہ کے لیے ذرا مڑ کر دیکھیں تو ہم انھیں ان کا نیا شوالہ دکھانا چاہتے ہیں جس کی قسمت میں تعمیر سے پہلے کھنڈر ہونا لکھا تھا گو اقبال اس وقت ایک دوسری شاندار تعمیر میں مصروف ہیں لیکن ایک روز انھیں ادھر آنا پڑے گا، اور وہ اُن کی شاعری کا تیسرا دور ہوگا۔

اُردو کیونکر پیدا ہوئی

(ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی پچیس سالہ یادگار مجموعہ میں جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں چھپا)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جب سے ہم کو معلوم ہوا ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک میں کبھی ایک بولی نہیں بولی گئی۔ درحقیقت یہ ملک ایک کرۂ عظم ہے جس میں ہر زمانے میں مختلف قومیں اور مختلف نسلیں جو مختلف بولیاں بولتی تھیں، آباد تھیں، آباد ہیں، اور آباد رہیں گی۔ دنیا کی زبانوں کی تین مشہور اصلیں، آریائی، تورانی اور سامی تینوں

یہاں دوش بدوش ملی جلی ملتی ہیں۔ دڑاوڑی زبانوں کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے۔ صوبوں کی دوسری زبانیں آریائی ہیں اور عربی کی شمولیت سامی کا نتیجہ ہے۔

چند مشہور راجاؤں کے زمانوں کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصوں پر حکمراں رہے، ہندوستان کا اکثر یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے مختلف مستقل ریاستوں کی صورت میں رہے اُن صوبوں کی وسعت راجا کے قوت اور فتوحات کے دائرے کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی ہر ریاست کی زبان اس کے صوبے کی مقامی زبان تھی اور وہی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب جس قدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا اسی حد تک اس زبان کا جغرافیائی دائرہ کبھی گھٹ اور کبھی بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً دیکھئے کہ اودھ کی بولی۔ برج کی بھاشا مگدھ کی زبان اطراف دہلی کی ہریانی یہ چاروں ہمسایہ ہیں مگر ان کی حدیں اپنی سلطنتوں کی حدوں سے وابستہ نظر آتی ہیں مگدھ (بہار) کی بدھ سلطنت جس کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا۔ جب ہندوستان پر چھا گئی تو اس کی زبان بھی ہندوستان کی عام سرکاری زبان بن گئی اور آج اسی مگدھ کی پالی زبان کے کتبے پشاور سے لے کر مہاراشٹر کے کناروں تک ملتے ہیں۔

ہندوستان میں سندھ سے لے کر گجرات تک کا علاقہ ہمیشہ ایرانیوں اور عربوں کے جہازوں کا گذرگاہ رہا اور اسی کا اثر تھا کہ جہازیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی زبانوں کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلتے رہتے تھے۔ خصوصاً سندھ (وہ صوبہ تھا)۔ جو اکثر ایران کی سلطنت کا جزو بنتا

اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا، سندھ کے آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات اس نظریہ کی صداقت کو روز بروز آشکارا کرتی جا رہی ہے۔

بہر حال آریائی زبان کی دوسری شاخ ایرانی یا فارسی کا اثر سندھ سے لے کر گجرات تک وسیع تھا، اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے خاتمہ کے قریب ساتویں صدی عیسوی میں فارس کی فتح کے بعد عربوں نے بھی ایرانی سلطنت کے جانشین کی حیثیت سے سندھ پر قبضہ کیا اور ان کے جہازات خلیج فارس کے اُبلہ سیراف اور بصرہ نامی بندرگاہوں سے نکل کر سندھ، گجرات اور ملیبار ہو کر چین تک جانے لگے، ان جہازوں کے چلانے والے فارسی و عربی بولتے تھے، اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندوستان کے جن بندرگاہوں سے گزرتے ہوں وہاں ان کی زبانو کے کچھ الفاظ مستعمل ہو جائیں اور وہاں کے مقامی زبانوں کے کچھ لفظ ان جہازیوں کے زبانوں پر چڑھ جائیں چنانچہ اس کی مثالیں عرب جہازیوں اور ملاحوں کی زبانوں میں ملتی ہیں۔ چنانچہ آج بھی ہندوستانی جہازوں کے ذریعے ہندوستانی زبان افریقہ، عرب عراق اور مصر کے بندرگاہوں تک پہنچ گئی ہے اور خود مجھے عدن، جدہ، پورٹ سعید، مصوع اور پورٹ سوڈان میں ہندوستانی بولنے والے ملاح اور دکاندار ملے۔

اس موقع پر ہمارے سامنے سب سے پہلا بیان ایک ملے جلے ایرانی عرب جہازران بزرگ بن شہریار کا ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ایک عرب جہازران ابو محمد حسن نے بیان کیا کہ

میں ۲۸۸ھ میں منصورہ (بھکر) میں تھا وہاں مجھ سے
متعدد ثقہ لوگوں نے بیان کیا کہ الرا داؤں کے راجا نے جو
ہندوستان کا بڑا راجا تھا اور جس کی حکومت کشمیر بالا اور
کشمیر زیریں کے بیچ میں تھی اور جس کا نام مہروگ بن
راتوق (؟) تھا، ۲۷۰ھ میں منصورہ کے بادشاہ عبداللہ
کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال اس کو بتلائے تو
عبداللہ نے منصورہ میں ایک عراقی کو پایا جو بہت تیز
طبع اور خوش فہم تھا اور شاعر تھا اور جس نے ہندوستانیوں
میں نشو و نما پائی تھی اور جو اہل ہند کی مختلف زبانوں سے
واقف تھا۔ اس نے ایک قصیدہ لکھ کر راجا کو بھیجا راجا
نے اس کو بلا بھیجا اور اس کے حکم سے اس نے قرآن کا ہندی
زبان میں ترجمہ کیا۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستان کے سواحل میں بھی بہت
سی مختلف زبانیں تھیں اور وہ لوگ جن کی اصل زبان فارسی اور عربی تھی
وہ یہاں کی زبانوں کو سیکھتے اور بول لیتے تھے اور ان میں یہ لیاقت رکھتے تھے
کہ وہ ان میں شاعری کر سکتے تھے اور قرآن پاک جیسی کتاب کا ترجمہ کر سکتے
تھے۔

ہندوستانی اور اسلامی زبانوں کے باہمی اختلاط اور میل جول
کے امکان کا پہلا واقعہ ہے جو سفرناموں اور تاریخوں میں مذکور ہے۔ اس
واقعے کا زمانہ ۲۷۰ھ یعنی ۸۸۳ء ہے اور آج سے قریباً ایک ہزار
اسی سال پہلے کی بات ہے۔

اس کے ۳۲ برس کے بعد ۳۰۳ھ میں مسعودی ہندوستان آتا ہے وہ ہندوستان کا ابتدائی حال اس طرح لکھتا ہے۔

"اس کے بعد شہر کے لوگوں کے خیالات مختلف ہو گئے اور مختلف گروہ پیدا ہو گئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کر لی تو سندھ پر ایک راجا بنا اور قنوج پر دوسرا راجہ بنا اور کشمیر میں تیسرا راجا تھا اور مانگیر (مانکھیر) پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات اور کاٹھیاواڑ) بلہرا (وبھورائے) کی حکومت ہوئی اور اب تک ہمارے زمانے تک ۳۳۲ھ ہے یہ راجہ اسی لقب سے ملقب ہے اور ہند کی زمین بہت وسیع ہے۔ خشکی پہاڑ اور دریا میں پھیلی ہے۔ ان کا ملک ایک طرف زابج (جاوہ) سے ملتا ہے جو جزیروں کے بادشاہ مہراج کا دارالمملکت ہے اور یہ ملک ہندوستان اور چین کے درمیان حد فاصل ہے لیکن ہندوستان کی طرف منسوب ہے اور دوسری طرف کوہستان سے متصل خراسان اور سندھ اور تبت تک ہے اور ان (ہندوستانی) ریاستوں میں باہم اختلاف اور لڑائیاں ہیں اور ان کی زبانیں الگ الگ ہیں اور ان کی مذہبی خیالات مختلف ہیں۔ زیادہ تر لوگ تناسخ اور رام واگون کے قائل ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہم نے کہا ہے۔

اس کے بعد یہی سیاح سندھ کے حال میں کہتا ہے۔

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ

ہے..... اور مانگیر (مانکھیڑ) کی زبان جولیرا (دلیھ
رائے) کا دارالسلطنت ہے گیری ہے اور اس کے ساحلی
شہروں جیسے جیمور، سوپارہ اور تھانہ (موجودہ بمبئی کے پاس)
کی زبان لاری ہے"

یہ سندھ، گجرات، کاٹھیا واڑ اور کوکن کی زبانوں کی نسبت قدیم عربی
شہادت ہے اس کے بعد بغدادی سیاح اصطخری کا زمانہ ہے جو ۳۴۰ھ میں
آیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

"منصورہ (موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور
ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران
والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔

بعینہ یہی الفاظ ابن حوقل کے سفرنامے میں ملتے ہیں اس کا زمانہ
۳۳۱ھ سے ۳۵۸ھ تک ہے وہ کہتا ہے۔

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں
عربی اور سندھی بولی جاتی ہے۔

۳۷۵ھ (۹۸۵ء) میں بشاری مقدسی ہندوستان آتا ہے، وہ ملتان
کے حال میں لکھتا ہے۔

"اور فارسی زبان سمجھی جاتی ہے"

پھر دیبل یعنی ٹھٹھہ کے بندرگاہ کے حال میں لکھتا ہے۔

"دیبل (ٹھٹھہ) سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے
چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں اکثر غیرمسلم سندھ
ہیں سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر لگتا ہے

سب سوداگر ہیں ان کی زبان سندھی اور عربی ہے۔"
ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے سندھ کی زبانوں کی نسبت جس کی وسعت میں اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے۔

"یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہب والے ہیں اور اُن کے لکھنے کے کئی خط ہیں۔ مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو اُن کے ملک میں گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ ان کے یہاں دو سو خط کے قریب مستعمل ہیں میں نے بغداد کے قصر حکومت میں ایک بت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھ سے کہا گیا کہ یہ بدھ کی مورت ہے، ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا۔"

اب وہ زمانہ آیا جب سلطان محمود کا باپ سبکتگین اپنی نئی سلطنت کا پھیلا بنا کر کھڑا کر رہا تھا۔ اب ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت آیا۔ اس وقت پشاور اور پنجاب اور غزنین میں صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے۔ آمدورفت لڑائی کی بھڑائی اور صلح و پیام کے لئے دونوں قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موقع آگیا تھا۔ اس وقت لڑائیوں کے ہزاروں ہندو قیدی اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی افغانستان اور ترکستان میں گھر گھر پھیلے تھے۔ امیر سبکتگین کی فوج میں دوسری قوموں کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے۔

"و لشکر خواستن گرفت، و بسیار مردم جمع شد از ہند و خلج و از ہر دستی"

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا
جو بچپن میں شیراز پہنچ گیا تھا، اور فارسی سیکھ لی تھی، اور ہندوؤں کے ساتھ
نامہ و پیام اور مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی۔
"و خطے نیکو بہ ہندوی و فارسی و مدتے دراز بہ کشمیر رفتہ بود و شاگردی
کردہ ... و او را دبیری و مترجمی کردے با ہندوان"
ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ آل سبکتگین میں اپنے زمانے یعنی سلطان
مسعود یعنی ۴۲۱ھ سے ۴۳۲ھ کے عہد میں اسی قسم کے ایک اور ہندو
مترجم بیربل کا ذکر کرتا ہے جس کا تعلق ان کے دفتر انشا سے تھا۔
ہم چناں بیربل بدیوان ما۔
سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے اہل علم تھے۔
وہاں ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم رہتے تھے، کالنجر کے راجا نندا
نے ۴۱۳ھ میں جب سلطان کی شان میں ہندی شعر لکھ کر بھیجا اس موقع پر
فرشتہ میں لکھتا ہے۔
"نندا بہ زبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد
او فرستاد۔ سلطان آن را بہ فضلائے ہند و عرب و عجم کہ
کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفرین کردند"
یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور بھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں
بھی سلطان کے دربار میں عرب و عجم اور ہند کے فضلا پہلو بہ پہلو بیٹھتے
تھے اور سب آشنا در خور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھیں اور مزہ لیں۔
غزنوی بادشاہوں کے زمانے میں جب پنجاب غزنیں کا صوبہ
تھا، ہزاروں لاکھوں مسلمان جن کی زبان فارسی تھی پنجاب میں بس گئے تھے

ظاہر ہے کہ ان میں اور عام اہلِ ہند میں بول چال اس طرح ہوگی کہ وہ ہندی ملی ہوئی فارسی اور یہ فارسی ملی ہوئی ہندی بولتے ہیں، اور چند روز میں یہ کیفیت ہوگئی کہ مسلمان ہندی میں یا فارسی آمیز ہندی میں شاعری کرنے لگے، چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ نے جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اور لاہور ہی میں رہتا تھا، ایک دیوان عربی کا، ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا یادگار چھوڑا۔

دیکھے یہ تازی دیکھے یہ پارسی دیکھے یہ ہندی''

(لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص۲۴۶ لکھا)

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ ایک ترک خاندان جو دہلی میں رہ پڑا تھا، اس میں امیر خسرو المتوفی ۷۲۵ھ) جیسا ہمہ داں شاعر پیدا ہوا، جس نے عربی فارسی ہندی میں علیحدہ علیحدہ بھی اور تینوں زبانوں کے مصرعے یا لفظوں کو ملا کر بھی شاعری کی، چنانچہ انھوں نے خود اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں اس پر فخر کیا ہے۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیوں کے نام لئے ہیں :۔ سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی، گوڑ، بنگالہ کا ایک حصہ) گجراتی، تلنگی، معربی، کرناٹکی جس کو کنڑی کہتے ہیں) دھور سمندری، دھور سمندر کا رد متاڑل کا پایہ تخت تھا جو اس زمانے میں نیا فتح ہوا تھا) اودھی اور دہلوی)

یہی زبانیں تھوڑے تھوڑے فرق سے اب بھی موجود ہیں، امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانے میں بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہی بولیاں رائج تھیں، ابوالفضل ہندوستان کی

مستقل زبانوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شالی (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے) بلوچستانی اور کشمیری۔

اوپر کے اقتباسات سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس ملک میں ہر زمانے میں صوبے وار بولیاں بولی جاتی تھیں اور اس میں کوئی ایک عام اور مشترکہ بولی نہ تھی اور دوسری یہ کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قدرتی طور سے ایک زبان تیار ہو رہی تھی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے چھ سو برس قیام کے بعد بھی ملک میں زبانوں کے اختلاف کا یہی حال رہا کہ ایک صوبے کا رہنے والا دوسرے صوبے کے رہنے والے سے بات چیت اور کاروبار کرنے سے عاجز تھا۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ملک جس میں کم از کم ۱۳ مستقل زبانیں بولی جاتی ہوں، اس کو ایک مملکت ایک حکومت اور ایک ملک کیونکر قرار دیا جا سکتا تھا اور ایسی مختلف بولیوں اور زبانوں والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لئے ایک متحدہ و مشترکہ زبان کی کتنی سخت ضرورت تھی، یہی بات تھی جس نے اس ملک میں ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا اور اس کو ترقی دی۔

اسلامی عہد کے ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی جن میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل سندھی، گجراتی، دکھنی اور دہلوی ہیں، جن صوبوں کی بولیوں کو

الگ وجود نہیں بخشا گیا۔ ان میں بھی یہ اب تک ماننا پڑتا ہے کہ ان کی دو قسمیں ہیں، ایک مسلمانی بولی سے الگ ہے، مسلمانی بنگالی، مسلمانی مرہٹی، مسلمانی تلنگی، خالص بنگالی، خالص مرہٹی، اور خالص تلنگی سے الگ اور ممتاز ہے یہ امتیاز یہی ہے کہ مسلمان ان صوبہ دار بولیوں میں عربی، فارسی لفظوں کو ملا کر بولتے ہیں اور ان صوبوں کے اصل باشندے اُن کو خالص اور بے میل بولتے ہیں۔

اب صورت یہ ہوئی کہ ہر صوبے کے مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی۔ مسلمانوں اور سندوں کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے کہا گیا۔ سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں اور پھر یہاں سے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک ہوا ہوگا۔ اس میل جول سے جو زبان بنی اُس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے۔ سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھہ پر ناکام حملہ کر کے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھہ والوں نے اس کو اپنے شیخ کی کرامت سمجھ کر کہا۔

"برکت شیخ پتھیا۔ اک موا، اک تھا"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی کہ ایک حملہ آور سلطان محمد شاہ تغلق جس نے ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا۔ مر گیا اور دوسرا فیروز شاہ تغلق ناکام رہا۔
عبارت سے یہ آئینہ ہے کہ اس زمانے (۷۶۲ھ) میں عربی فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج آپ اردو کہتے ہیں۔ پیدا ہو چکا تھا۔ اُن واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ مختلف قوموں کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا۔ اور اسی

ضرورت نے اس نئی زبان کو وجود بخشا تھا۔ اس زبان کی پیدائش کی اور پیدائش کی نہ سہی تو اس کے قیام بقا اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھ کر ناگزیر ایک اور ہے، مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمراں ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جس کا تعلق پورے ملک سے ہو، اس ملک میں کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترکہ زبان موجود نہ تھی، لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے، مگر ان پڑھ ناخواندہ اور عوام کے لئے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی، جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت، اور کاروبار میں کار آمد ہو اور بعینہ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے۔

اردو نام

زبان اردو کی تاریخ کے متعلق میر امن اور سر سید اور دوسرے پرانے بزرگوں نے جو بیان سنایا تھا، وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے، اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گزار راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا ہے۔ اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک لگایا جا چکا ہے، اور آج سے پانچ سو برس پہلے کے فقرے جمع کئے گئے ہیں اور تیموری بادشاہوں سے بہت پہلے کی نظم و نثر کی کتابیں مہیا کی گئی ہیں، اور اب چہار درویش کے مصنف میر امن کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگوں کی کہانی سمجھتے ہیں۔

حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، انہی کے راجا پرجا

قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے
مسلمانوں کا عمل رہا۔ سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور
لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں
نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے
گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے،
ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر
میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب چاروں طرف کے ملکوں سے
سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی
سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی
جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سود سلف
سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی۔
جب حضرت شاہجہاں صاحبقراں نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد
اور شہر پناہ تعمیر کرائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب سے شاہجہاں آباد مشہور
ہوا۔ اگرچہ دلی جدی ہے اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں
کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔
ان چند سطروں میں اردو کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ زمانہ
اور اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سرتاپا حقیقت ہے یعنی یہ کہ موجودہ
اردو دہلوی زبان دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے، آج کل بعض
فاضلوں نے پنجاب میں اردو، اور بعض اہل دکن نے دکن میں اُردو
اور بعض عزیزوں نے گجرات میں اردو کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبے کے مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے اُن سب کا نام اردو ہی رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ ان کا نام پنجابی، دکھنی، یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہئے جیسا کہ اس کے عہد کے لوگوں نے کہا ہے یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے تو خود پائے تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوئے۔

امیر خسرو اور ابو الفضل دونوں نے دہلوی زبان کا الگ نام لیا ہے۔ عہد شاہجہانی میں جب یہاں اردوئے معلیٰ بنا تو اس زبان دہلی کا نام زبان اردوئے معلیٰ پڑ گیا۔ چنانچہ لفظ اردو زبان کے معنی میں دہلی کے علاوہ کسی صوبے کی زبان پر اطلاق نہیں پایا ہے۔ میر تقی میر کی تحریری سند میں جب اُس کا نام پہلی دفعہ آیا ہے تو اصطلاح کے طور پر نہیں بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے۔ یعنی میر نے اردو زبان نہیں کہا بلکہ اردو کی زبان کہا ہے۔

"ریختہ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلیٰ بادشاہ ہندوستان" ذکر میر ۲۳ بادشاہ ہندوستان کے کیمپ یا پایۂ تخت کی زبان"۔

اس کے بعد عام استعمال میں زبان اردو کے بجائے خود زبان کا نام اردو پڑ گیا اور پھر یہ اردوئے معلیٰ سے نکل کر ملک میں ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی جس اصول پر ہندوستان میں ہمیشہ راجدھانی کی بھاکا تمام حدود سلطنت میں پھیلتی رہی ہے۔

اس زبان کی اصلیت کیا ہے۔ ہم نے پچھلی سطروں میں اس کو

پارسی زبان کہا ہے مگر کیا حقیقت میں اس کو نئی زبان کہنا چاہیے؟ ہم
جس کو آج زبان اردو سے سعلی کہتے ہیں۔ حقیقت میں وہ دہلی
اور اطراف دہلی کی وہ پرانی بولی ہے جو یہاں پہلے سے بولی جاری
تھی اور جس نے زمانے کے قاعدے کے مطابق انقلاب آنا رچڑھا ؤ اُتار
خداد ہو کر لفظوں کی مناسب صورت بن گئی۔

ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے۔ اسم فعل اور حرف
اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں۔ فعل جتنے ہیں وہ دہلوی ہندی
کے ہیں۔ حرف جتنے ہیں۔ ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں البتہ
اسم میں آدھے اس ہندی کے اور آدھے عربی، فارسی اور ترکی کے
لفظ ہیں۔ اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ مل گئے ہیں جن کے
مسمیٰ ان باہر کے ملکوں سے ہیں جیسے نیلام پاؤ (روٹی) پادری،
الماری وغیرہ۔

اس لئے اردو اور ہندی (وہ بھی دہلوی ہندی) میں صرف دو
فرق ہیں۔ دہلوی ہندی تو اپنی جگہ پر رہ گئی لیکن اسی ہندی میں اس
وقت کے نئے ضروریات کے سبب سے عربی فارسی اور ترکی کے وہ
الفاظ آ کر ملے جن کے معنی اور مسمّٰی ان ملکوں سے آئے تھے۔ دوسرا فرق
یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط میں اور یہ اردو فارسی خط میں لکھی
جانے لگی۔

رفتہ رفتہ ایک اور بھی فرق پیدا ہوا کہ پرانی ہندی کے
بہت سے لفظ جو زبان پر بھاری اور ثقیل تھے۔ زمانہ اور زبان
کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان میں ہلکا پن خوبصورتی اور

خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح عربی اور فارسی اور ترکی کے لفظوں میں بھی اپنی طبیعت کے موافق اُس نے تبدیلیاں پیدا کیں۔

اردو نے ہندی کے لفظوں میں اس قسم کا جو تغیر کیا ہے اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

ہندی	اردو	ہندی	اردو
گرنتھ	گُٹ	جیو	جی
براہمنڑ	برہمن	شکتی	سکت
راونڑ	راون	رکھشا	رکھ
ودا	بیاہ	پہنچا	پہنچا
جیشٹھ	جیٹھ	کنتو	کیونکہ
ورش	برس و سال	مائی	ماں
پرنتو	پر (مگر)	سمے	سماں
اوچت	اچھا	دیش	دیس
سمبندھی	سمدھی	لکھشن	لچھن
ویاگھر	بیاگھ	ناش	ناس (خراب)
وچار	بچار	اگنی	آگ
کھشتری	کھتری	پورن	پورا
ہنش	ہنس (جیسے کھلے ہانس)	مورتی	مورت
سنگھ	بیتھ	ست یا ستیہ	سچ

ہندی	اردو	ہندی	اردو
درشٹ	برسات	کٹمب	کٹم (خاندان)
وارتا	بات	اٹ	آٹا
ہستی	ہاتھی	پانیں	پانی
بادر	بادل	ددھے	دہی
دُگدھ	دودھ یا دود	گھرت	گھی
نا	نہ	بھن بھن	بھانت بھانت

اب چونکہ پورا ملک ایک تھا اور ہمیشہ آمد و رفت لگی رہتی تھی، اِس لیے اس دہلوی ہندی میں سیکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ رل مل گئے، خصوصًا پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی۔

کہیں یہ ہوا کہ فارسی اور ہندی دونوں کے ہم معنی لفظوں کو ایک جگہ کرکے بولنا شروع کیا، تاکہ دونوں زبانوں کے الگ جاننے والے ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لیں، جیسے دھن، دولت، رنگ روپ، رنگ ڈھنگ، خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق، ہنسی خوشی، بھائی برادر، رشتہ ناتا، داغ دھبا، دکھ درد، صاف ستھرا، ریت رسم، کبھی فارسی لفظ میں ذرا سی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں، جیسے جن مجوز یا مزدور یعنی مزدور، لونڈی یا باندی (بندی، بندہ یعنی غلام)۔

ان دونوں کو دو زبانوں کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لیے یہ چاہیے کہ ان دونوں کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنا لیں جن کو دونوں نباہتے جائیں۔

(معارف جولائی ۱۹۳۹ء)

ہم اور ہمارا امتحان

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ ذوق مرحوم فرما گئے ہیں:

اے شمع تری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اُسے رو کر گزار دے

بعض انسان دنیا کے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں اور بعض روشن پہلو کو۔ ایک ہی چیز ایک کو بری معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کو اچھی۔ امتحان ایک کے لئے آفت جان ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے دلفریبی۔ ان ہی دو رُخوں کو دو صاحبوں نے اپنی سرگذشت میں دکھایا ہے۔ اس کے روشن رُخ کا کچھ حصہ رسالہ افادہ میں چھپا تھا۔ مگر وہ رسالہ کے حق میں غالباً کافی شدید ہو گیا۔ اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی رسالہ افادہ کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

اب یہ دونوں رُخ رسالہ نمائش کے لئے بھیجتا ہوں۔ دونوں کو ایک ہی پرچہ میں چھاپ دیجئے۔ تاکہ آپ کے رسالے کا حشر بھی اس کی نحوست سے کہیں وہ نہ ہو جو رسالہ افادہ کا ہوا۔ اگر چھاپنے کی ہمت نہ ہو مضمون واپس کر دیجئے۔ جو ایڈیٹر صاحب اپنے رسالہ کی بنیاد کو سخت قوی سمجھتے ہیں ان کو بھیج دوں گا۔ دیکھوں وہ بھی اس نحوست کی تاب لاتے ہیں یا نہیں۔ والسلام (مرزا الم نشرح)

تصویر کا ایک رُخ

نہ ہوئی گر مرے پرچوں سے تسلی نہ سہی   امتحان اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

لوگ امتحان کے نام سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے ان کے گھبرانے پر ہنسی آتی ہے۔ آخر امتحان ایسا کیا ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں۔ فیل یا پاس۔ اس سال کامیاب نہ ہوئے آئندہ سال سہی۔ میں اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو دیکھتا تھا کہ جوں جوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے ان کے حواس پراں۔ ان کا دماغ مختل اور ان کی صورت اتنی سی نکل آتی تھی۔ بندہ درگاہ پر امتحان کا ذرہ برابر اثر پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ گو امتحان سے اب فارغ ہو چکا ہوں لیکن اب بھی اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہے۔ امیدواروں کا مجمع نئی نئی صورتیں عجیب عجیب خیالات یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کبھی دل سیر نہیں ہو سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ تمام عمر امتحان ہوتے جائے لیکن پڑھنے اور یاد کرنے کی شرط اٹھا دی جائے۔ میری سنئے کہ دو سال میں لا کلاس کا کورس پورا کیا مگر کس طرح۔ شام کو یاروں کے ساتھ ٹہلنے نکلتا۔ واپسی کے وقت لا کلاس میں بھی جھانک آتا۔ منشی صاحب دوست تھے اور لکچرار صاحب پڑھانے میں مستغرق حاضری کی تکمیل میں کچھ دشواری نہ تھی اب آپ ہی بتائیے کہ لا کلاس میں شریک ہونے سے میرے کس مشغلہ میں فرق آ سکتا تھا والد صاحب قبلہ خوش تھے کہ بیٹے کو قانون کا شوق ہو چلا ہے کسی زمانہ میں بڑے بڑے وکیلوں کے کان کترے گا۔ ہم بھی بے فکر تھے کہ چلو دو برس تو کوئی محنت کے لئے کہہ ہی نہیں سکتا۔ بعد میں دیکھئے کون جیتا ہے اور کون مرتا ہے۔ لیکن زمانہ آنکھ بند کئے گزر جاتا ہے دو سال ایسے گزر گئے جیسے ہوا۔ لا کلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا

ـہ کیا تھا۔ والدین امتحان وکالت کی تیاری کے لئے سر ہوگئے مگر میں بھی
ایک ذات شریف ہوں ایک بڑھیا اور ایک بڈھے کو دھوکا دینا کیا
بڑی بات ہے میں نے تقاضا کیا کہ علیحدہ کمرہ مل جائے تو محنت کروں
بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ چند روز اسی حیلے سے
ٹال دئے۔ لیکن تابکے! بڑی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا۔
اب میں دوسری چال چلا۔ دروازوں میں شیشے تھے۔ اُن پر کاغذ چپکا
دیا لیمپ روشن کرکے آرام سے سات بجے سے سو جاتا اور صبح نو بجے
اُٹھتا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ
میری پڑھائی میں خلل ڈالا جاتا ہے۔ اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے
کا الزام لگایا گیا تو کہہ دیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔
آئندہ کوئی مجھے دق نہ کرے۔ بعض وقت ایسا ہوا کہ لیمپ بھڑک کر
چمنی سیاہ ہوگئی اور میری زیادہ محویت و محنت کا نتیجہ سمجھی گئی۔ بعض
وقت والد والدہ کہتے بھی تھے کہ اتنی محنت نہ کیا کرو۔ لیکن میں زمانہ
کی ترقی کا نقشہ کھینچ کر اُن کا دل خوش کر دیا کرتا تھا۔ خدا خدا کرکے
یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ اور امتحان کا زمانہ قریب آیا۔ میں نے
گھر میں بہت کہا کہ ابھی میں امتحان کے لئے جیسا چاہیئے ویسا تیار
نہیں ہوں۔ لیکن میری مسلسل حاضری لاکلاس اور شبانہ روز کی
محنت نے اُن کے دلوں پر سکہ بیٹھا رکھا تھا۔ وہ کب ماننے والے تھے
پھر بھی احتیاطاً اپنے بچاؤ کے لئے اُن سے کہہ دیا کہ اگر میں فیل ہو جاؤں
تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو ابھی امتحان
کے قابل نہیں پاتا۔ لیکن والد صاحب مسکرا کر بولے کہ امتحان سے

کیوں ڈرے جاتے ہو۔ جب محنت کی ہے تو شریک بھی ہو جاؤ۔ کامیابی
د نا کامیابی خدا کے ہاتھ ہے ؎

مرد باید کہ ہراساں نہ شود

میں نے بھی تقدیر اور تدبیر پہ ایک چھوٹا سا لکچر دے کر ثابت
کر دیا کہ تدبیر کوئی چیز نہیں۔ تقدیر سے تمام دنیا کے کام چلتے ہیں۔

قصہ مختصر درخواست شرکت دی گئی اور منظور ہو گئی اور ایک
دن وہ آیا کہ ہم ہال ٹکٹ لئے ہوئے مقام امتحان پر پہنچ ہی گئے۔ گو یاد
نہیں کیا تھا لیکن دو وجہ سے کامیابی کی امید تھی اوّل تو امداد غیبی دوسرے
پرچوں کی اُلٹ پھیر۔ شاید وہ حضرات جو امتحان میں کبھی شریک نہیں
ہوئے۔ اس مضمون کو نہ سمجھیں۔ اس لئے ذرا وضاحت سے عرض کرتا
ہوں امداد غیبی سے مراد امیدواران امتحان کی اصطلاح میں وہ مدد
ہے جو ایک کو دوسرے سے یا کسی نیک ذات نگران کا رسے یا عند الموقع
کتابیں سے پہنچ جاتی ہے۔ پرچوں کی اُلٹ پھیر گو۔ بظاہر مشکل معلوم ہوتی
ہے لیکن تقدیر سب کچھ آسان کر دیتی ہے۔ بعض شریف کم حیثیت ملازم
ایسے بھی نکل آتے ہیں جو با امید انعام پرچے بدل دیتے ہیں یہ ضرور ہے
کہ اس سے ایک محنت کرنے والے کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن تقدیر کا
مسئلہ اس کارروائی میں حل ہوتا ہے۔ دوسری کسی صورت میں حل نہیں
ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں لیکن وہ بہت کم پیش آتی ہیں
اس لئے اِن پر بحث کرنا نادانی ہے۔ خیر آمدم بر سر مطلب۔ پورے
دس بجے گھنٹی بجی اور ہم بسم اللہ کہہ کر امتحان میں داخل ہوئے
یہاں ایک بہت خلیق اور منس مکھ نگراں کار تھے۔ مجھے جگہ نہیں ملی تھی

میں نے اُن سے کہا وہ میرے ساتھ ہو لئے۔ جگہ بتائی اور بڑی دیر
تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے میں سمجھا چلو بیڑا پار ہے۔ اللہ
دے اور بندہ لے۔

ٹھیک دس بجے پرچہ تقسیم ہوا۔ میں نے پرچہ لیا۔ سرسری نظر ڈالی
اور میز پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پرچہ پڑھنے کے بعد جیسا میرے
چہرے پر اطمینان تھا۔ شاید ہی کسی کے چہرے پر ہوگا۔ خود تو اس پرچے کے
متعلق اندازہ نہ کر سکا لیکن نگراں کار صاحب کو یہ کہتے ضرور سنا کہ پرچہ مشکل
ہے۔ میں کئی مرتبہ اوّل سے آخر تک اس کو پڑھ گیا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ کس
مضمون کا ہے جوابات کی کاپی دیکھی۔ اس کے آخر کی ہدایتیں پڑھیں۔
صفحہ اول کی خانہ پری کی اور رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ گارڈ صاحب فوراً ہی آئے میں نے
اُن سے کہا کہ جناب یہ پرچہ کس مضمون کا ہے، وہ مسکرائے زبان سے تو کچھ
نہ بولے مگر پرچے کے عنوان پر انگلی رکھ دی۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا
کہ "اصول قانون" کا پرچہ ہے دل کھل گیا۔ اب کیا تھا میں نے بھی قلم
اُٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اصول کے لئے کسی کتاب کے پڑھنے
کی ضرورت تو ہے ہی نہیں۔ اس مضمون پر ہر شخص کو رائے دینے کا
حق حاصل ہے۔ ایک مقنن ایک اصول قائم کرتا ہے۔ دوسرا اس کو
توڑ دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو کسی دوسرے کی تجویز کا
پابند کریں، میں نے اپنے برابر والے سے پوچھنے کی کوشش بھی کی۔
کچھ اِدھر اُدھر نگاہ بھی دوڑائی، مگر گارڈ صاحب میری حالت کو کچھ
ایسا تاڑ گئے تھے کہ ہر وقت بلائے ناگہانی کی طرح سر پر ہی کھڑے
رہتے تھے۔ ذرا میں نے اِدھر اُدھر گردن پھیری اور اُنھوں نے

آواز دی کہ "جناب اپنے پرچہ پر نظر رکھئے"

جب دوسروں سے مدد ملنے کی توقع منقطع ہو گئی تو میں نے سوچا کہ چلو ان گارڈ صاحب ہی سے پوچھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آئے میں نے دریافت کیا کہ "جناب اس دوسرے سوال کا کیا جواب ہے" وہ مسکرائے اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں میں نے کہا کہ یہ برابر والے بڑے زور سے لکھ رہے ہیں۔ ان سے پوچھ دیجئے۔ اور اگر آپ کو دریافت کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے تو ذرا ادھر ٹہلتے ہوئے تشریف لے جایئے میں خود پوچھ لوں گا۔ مگر وہ کب ملنے والے تھے۔ قطب ہو گئے۔ ان کا مسکرانا پہلے تو اچھا معلوم ہوتا تھا لیکن پھر آخر میں تو زہر ہو گیا میں واللہ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام عمر میں قلبی نفرت مجھے کسی سے ہوئی ہے تو انہیں صاحب سے ہوئی ہے۔ ان کا وہ مسکراتے ہوئے ٹہلنا مجھے ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ اگر میرے برابر کھڑے ہو کر یہ مسکرائے تو ضرور گلے پڑ جاؤں لیکن پھر سوچا کہ سرکاری معاملہ ہے کہیں بیٹھے بٹھائے کسی مصیبت میں نہ پڑ جاؤں۔ اس لئے چپکا ہو رہا۔ غرض اس طرح یہ تمام دن امتحان کا گزر گیا لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ظالم کے ساتھ ایسی حالت میں کہ ایک حرف بھی یاد نہ ہو۔ پورے چھ گھنٹے گزارنے کیسے مشکل ہوں گے۔ میں تو ہر روز آدھ گھنٹہ کے بعد ہی کمرے سے نکل آتا۔ لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ والد صاحب روز گیارہ بجے سے آ جاتے اور نیچے صحن میں بیٹھے رہتے۔ اب میں جلدی باہر آ جاتا تو جو رعب میں نے دو سال کے عرصہ میں قائم کیا تھا وہ سب ہوا ہو جاتا۔ اس لئے چہرہ پریشان دروغ

آخری وقت تک کمرۂ امتحان میں بیٹھے رہتا اور جب نیچے اترتا تو والد
صاحب سے پرچے کی سختی کی ضرور شکایت کرتا۔ وہ بھی میری
تشفی کے لیے ممتحن کو بہت کچھ برا بھلا کہتے۔ لیکن ان کو یہ خیال
ہوگیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میرا بیٹا کامیاب ضرور ہوگا۔ امتحان
ختم ہوا اور امید نمبر ایک اور ۲ کا خوف ہوگیا۔ اب ممتحنوں کے
پاس کوشش کی سوجھی۔ والد صاحب ایک زبردست چٹھی سفارش
کی لے کر ایک صاحب کے یہاں پہنچے۔ وہ چٹھی دیکھ کر بہت اخلاق سے
ملے۔ آنے کی وجہ دریافت کی۔ والد نے عرض کیا کہ خادم زادہ اس
سال امتحان میں شریک ہوا ہے۔ اگر آپ کوشش فرمائیں تو یہ خانہ
زاد ہمیشہ ممنون احسان رہے گا۔ وہ بہت ہنسے اور دوسرے
لوگوں سے جو سلام کو حاضر ہوئے تھے فرمانے لگے۔ یہ عجیب درخواست
ہے۔ ان کا بیٹا تو امتحان دے اور کوشش میں کروں۔ بندۂ خدا
اپنے لڑکے سے کہو کہ وہ خود کوشش کرے۔ بیچارے بڑے میاں
ایسے نادم ہوئے کہ پھر کسی کے پاس نہ گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد نتیجہ
بھی شائع ہوگیا اور کمترین حلیہ ستائیس میں سے بیچ اعلیٰ فیل ہوا
خبر نہیں کہ وہ کون سے بھلے مانس ممتحن تھے کہ انھوں نے ۳۰ نمبر بھی
دے گئے۔ باقی نے تو صفر ہی پر ٹالا۔ والد صاحب کو بہت رنج ہوا
عزیزوں کی تعلق حاصل کی اور بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ کسی
بدمعاش چپراسی نے پرچے بدل دئے ورنہ ممکن تھا کہ میرا ایسا
تین گھنٹے لکھا جاتا اور صفر ملتا۔ مجھے بھی تعجب تھا کیونکہ میں نے پرچے
کچھ ایسے برے نہیں لکھے تھے۔ فیصلہ کے دو ہی پہلو ہو سکتے تھے یا تو

مجھے یاد ہیں۔ وہ ناظرین کے سامنے پیش کرکے ان سے انصاف کا طالب ہوں۔ بقیہ پرچوں کے متعلق تو مجھے خود یاد نہیں رہا کہ سوال کیا تھا اور میں نے جواب کیا لکھا۔ لیکن میرے فیصلہ سے دوسرے جوابات کا اندازہ ہو جائے گا۔ فیصلہ دیوانی میں یہ مقدمہ دیا گیا تھا کہ ایک مکان گروی ہے مرتہن کہتا ہے کہ مکان رہن بالوفا تھا۔ مدت ختم ہو گئی اس لئے مکان اب میرا ہو گیا۔ راہن کہتا ہے کہ مرتہن کا قبضہ غاصبانہ ہے دونوں طرف سے شہادت پیش ہوئی ہے، مرتہن کے گواہوں کے بیانات سے میری رائے میں رہن بالوفا ثابت تھا۔ اور راہن کی شہادت سے قبضہ غاصبانہ۔ میں نے اس کا تصفیہ یہ کیا کہ مکان منہدم کرکے زمین اور ملبہ آدھا آدھا دونوں میں تقسیم کر دیا جائے اور چونکہ یہ تمام خرابی گواہوں کے پیچیدہ بیانات سے پڑی ہے۔ اس لئے مکان کے منہدم کرنے اور مقدمہ کا خرچ اُن سے دلایا جائے۔ میں اب بھی نہایت تدبر سے کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ صاف کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ نہ مرتہن کو شکایت کہ میرا مقدمہ خارج ہوا اور نہ راہن کو شکایت کہ اس کا مکان مفت میں دوسروں کو دے دیا گیا۔ اب اس فیصلہ پر بھی اگر ممتحن صاحب نمبر نہ دیں تو وہ جائیں اور ان کا دین ایمان جانے۔

فوجداری مقدمہ کی یہ صورت تھی کہ ایک جوان عورت کے خاوند کو ملازم نے مار ڈالا تھا۔ بیچاری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ شہادت میں جو گواہ پیش ہوئے اُنھوں نے بیان کیا کہ ہم نے ملزم کو قتل کرتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ ایک بیان کرتا ہے کہ اُس کا منہ شمال کی طرف

تھا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا منہ جنوب کی طرف تھا۔ ذرا انصاف کیجئے کہ جب یہ صورت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ ان دونوں کی پیٹھ ملزم اور مقتول کی طرف تھی، اوّل تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا بڑا واقعہ ہو رہا ہو اور یہ لوگ پیٹھ پھیرے کھڑے رہیں۔ دوسرے جب یہ پیٹھ پھیرے کھڑے تھے تو کیا ان کی پیٹھ پر آنکھیں تھیں جو انھوں نے اس واقعہ کو دیکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ اس لئے میں نے یہ تجویز کی کہ ان دونوں گواہوں کو دو سال قید با مشقت اور سو سو روپیہ جرمانے کی سزا دے کر ملزم کو بری کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ بیچاری مستغیثہ بیوہ ہو گئی۔ اس لئے اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ سرکاری طور پر مستغیثہ کا نکاح ملزم سے کر دیا جائے اور جو رقم جرمانہ گواہوں سے وصول ہو وہ اس نکاح میں صرف کی جائے۔ اب رہے بچے تو ان کے متعلق یہ تجویز کی گئی کہ ملزم کو ان کے رکھنے اور پرورش کرنے میں تامل ہوگا۔ اس لئے دونوں یتیم خانہ میں بھیج دئے جائیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ اس سے زیادہ اور کیا انصاف ہو سکتا ہے۔ اس پر بھی اگر ممتحن صاحب مجھ کو فیل کر دیں تو اس کو ظلم نہ کہیں تو کیا کہیں گے؟ انصاف آپ ناظرین کے ہاتھ میں ہے، میں نے یہ جوابات والد صاحب کو بھی سنائے، انھوں نے بہت تعریف کی۔ ممتحنوں کو بہت بُرا بھلا کہا۔ میری بہت اشک شوئی کی اور فرمایا بیٹا کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ اس سال نہیں آئندہ سال سہی۔ آخر کہاں تک بے ایمانی ہوگی۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ خیر ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

جو کچھ ہوا سو ہوا ایک سال کی فرصت تو مل گئی۔

تصویر کا دوسرا رُخ

بلا بلفظ عرب امتحان بود یعنی کہ بندہ را بہ بلا امتحان کند داور
بخدا امتحان بڑی سخت چیز ہے، خدا کسی کو امتحان میں نہ ڈالے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ جب امتحان کا خیال آجاتا ہے تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو جو مصیبتیں اس امتحان کے زمانہ میں مجھ پر گزریں۔ وہ سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ میرا دل اپنے امتحان کے واقعات لکھتے ہوئے کانپتا ہے مگر چند محبوں اور محسنوں کا اصرار ہے۔ اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

کسی زمانہ میں ہم لوگ بڑے سمجھے جاتے تھے۔ لیکن زمانہ کی گردش نے رفتہ رفتہ اچھی طرح پلٹ دیا۔ اور ایک وہ زمانہ آگیا کہ ہمارے رشتہ دار بھی تعلق ظاہر کرنے سے اجتناب ظاہر کرنے لگے۔

والد صاحب مرحوم کے زمانہ حیات تک کسی نہ کسی طرح گزری جاتی تھی لیکن مرحوم کی فراخ دستی اور اثاثہ کی کمی نے افلاس کی آخری حد تک ہم کو پہنچا دیا تھا۔ اُن کے انتقال کے وقت میری عمر کوئی سترہ سال کی تھی۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ لا کلاس کا پہلا سال بھی ختم ہی نہ ہوا تھا کہ یکایک انفلوئنزا میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تمام گھر بیمار پڑا بیماری کے اخراجات نے رہا سہا اور بھی ٹھکانے لگا دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب سب بیماری سے اُٹھے تو رہنے کا مکان بھی فروخت کرنا پڑا تھا۔ ایک چھوٹا سا مکان (عہ) کرایہ سے لے کر

جا رہے ہیں۔ گھر میں میری والدہ صاحبہ تھیں۔ میں اور میری چھوٹی بہن رضیہ
اس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ والدہ کے پاس سلائی کا کچھ کپڑا آ جاتا تا
اس سے اور تھوڑا بہت جو زیور رہا تھا۔ اس کو بیچ بیچ کر گذارہ
کرتے تھے۔ جب آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہو تو قارون کا خزانہ بھی کافی
نہیں ہوتا۔ تھوڑے دنوں میں جو کچھ رہا سہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس
عرصہ میں میری لا کلاس کی مدت بھی ختم ہو گئی اور امتحان کا زمانہ
بھی قریب آ گیا۔ اب سب سے بڑی مشکل فیس کی تھی۔ کوئی ایسی چیز
پاس نہ تھی کہ گروی رکھ کر یا بیچ کر یہ رقم ادا کی جاتی۔ کوئی ایسا ہمت والا
رشتہ دار نہ تھا کہ صرف بھروسے پہ پچاس ساٹھ روپے کی رقم دیتا۔
رضیہ کے پاس ایک چھلا اور پاؤں میں پازیب رہ گئی تھی۔ والدہ صاحبہ
نے کہا کہ اس کو فروخت کر کے کام چلاؤ۔ اگر خدا نے کیا تو شاید اسی
امتحان کے بعد ہمارے دن پھریں۔ میری غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ اس
معصوم کا زیور لوں۔ لیکن کیا کیا جاتا۔ اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔
والدہ صاحبہ رضیہ کا زیور اتارنے لگیں تو وہ مچل گئیں۔ انھوں
نے سمجھانا شروع کیا کہ دیکھو بھائی جان پاس ہو جائیں گے تو تم کو اتنا
زیور دیں گے۔ تمھارے نئے گڑیا [illegible] لائیں گے۔ تم کو اچھے اچھے کپڑے
سلوا دیں گے۔ میں یہ سب سنتا رہا۔ لیکن رضیہ کے ایک فقرہ نے
ایسا بیتاب کر دیا کہ مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ اس کا یہ کہنا کہ اگر
بھائی صاحب پاس نہ ہوئے تو؟ میرے دل پر تیر کی طرح لگا۔
والدہ سمجھاتی رہیں کہتیں بیٹا ایسی فال زبان سے نہیں نکالا کرتے
وہ انشاء اللہ ضرور پاس ہوں گے۔ لیکن جب یہ الفاظ کہے جا رہے تھے

کرانا کیا کام کرے گا۔ بہرحال والدہ صاحبہ نے چھنّی لال مارواڑی کے پاس
سات روپے میں دونوں چیزیں گروی کر دیں۔ مجھے ۱۵ روپے
دے کر کہا کہ فیس داخل کر آؤ۔ اور بقایا ۹ روپے گھر کے خرچ کے لئے
رکھ لئے۔ قصہ مختصر میں نے فیس داخل کر دی۔ رات دن محنت
کرتا۔ لیکن ہر وقت یہ فکر رہتی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ جب خیال آتا
تو بخار ہی چڑھ آتا۔ بیمار بھی پڑا۔ مگر دو چار روز میں اچھا ہو گیا۔ آخر
امتحان کا دن آ ہی گیا۔ اماں نے کہیں نہ کہیں سے کر کے دو دھان
پاؤ رات کو رکھ دیا تھا کہ صبح ہی صبح کھا کر چلا جاؤں گا لیکن رات
کو بلی دودھ پی گئی۔ صبح کو جو والدہ صاحبہ اٹھیں سر پکڑ کر رہ گئیں
گھر میں اس روز پیسہ نہ تھا۔ میں بھی اٹھا۔ انھوں نے مجھ سے ذکر
کیا۔ میں نے کہا اماں آپ ناحق فکر کرتی ہیں۔ مجھے آج بھوک نہیں
ہے۔ میں یہ کہہ کر چلا گیا۔ امتحان کے کمرہ میں اپنی جگہ تلاش کر لی۔
لیکن تھوڑی دیر میں بھوک کی وجہ سے چکر آنے لگے۔ اتنے میں پرچہ
تقسیم ہونا شروع ہو گیا۔ مجھے بھی ملا۔ میں نے دیکھا لیکن ایک
حرف سمجھ میں نہیں آیا۔ ساتھ ہی سر میں چکر آیا۔ اور آنکھوں کے
سامنے اندھیرا آ گیا۔ میں نے میز پر سر رکھ دیا۔ اس غفلت میں یہ
نظر آیا کہ والدہ رضیہ کے زیور اتار رہی ہیں۔ وہ مچل رہی ہے۔ یہ
اس کو سمجھا رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ بیٹا تیرے بھائی پاس ہو جائیں گے
تجھ کو یہ لا کر دیں گے۔ وہ لا کر دیں گے۔ رضیہ نے میری طرف غور
سے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ اور جو یہ پاس نہیں ہوئے
تو؟ میرا سلسلہ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ کسی نے آواز دی کہ

جناب یہ امتحان کا کمرہ ہے سونے کی جگہ نہیں ہے " میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ایک صاحب مسکراتے ہوئے میری طرف آئے اور کہا کہ "آپ امتحان دینے آتے ہیں یا سونے آئے ہیں - میں گھبرا ہو کر کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے - انھوں نے دوڑ کر مجھے سنبھالا - اور چپراسی کو آواز دی کہ پانی لاؤ - پانی آیا تو مجھے پلایا - اس وقت میرے حواس کچھ درست ہوئے پرچے کی طرف دیکھا - اس کے ساتھ رضیہ کا فقرہ یاد آیا - اور جو یہ پاس نہ ہوئے تو - اس کا یاد آنا تھا کہ گذشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور ساتھ ہی کمرہ بالکل تاریک معلوم ہونے لگا - نگراں کار صاحب یہ کیفیت برابر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے - کچھ سوچ کر میری طرف بڑھے اور کہا - بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہوشیار بھی ہیں اور ذہین بھی - اور محنت بھی کی ہے لیکن آپ کی اس حالت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی - کیا آپ بیمار ہیں - میں نے کہا نہیں - اُنھوں نے کہا کہ کیا آج آپ بھوکے تو نہیں ہیں - یہ لفظ سننے تھے کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے - میں چپکا ہو گیا - اُنھوں نے پھر وہی سوال کیا - میں نے کہا جی ہاں آج میں کھانا کھا کر نہیں آیا - اُنھوں نے کہا کیوں پہلے تو میں خاموش رہا - جب اُنھوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے بہت نیچی آواز میں کہا کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا - معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار اُن کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے - کیا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا - میں نے کہا جی ہاں کچھ نہ تھا میں نے اُن کی طرف نظر اُٹھائی تو اُن کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں - اور چہرہ پہ ایک قسم کی سُرخی دوڑ گئی تھی اُنھوں نے اسی

وقت چپراسی کو آواز دی کہ نیچے ہوٹل سے جا کر ایک پیالی چائے
تھوڑے سے بسکٹ اور دو تین سینڈوچ لے آؤ۔ یہ کہہ کر وہ
سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گئے اور ان سے کچھ کہہ کر میری طرف
آئے اور کہا آپ میرے ساتھ آئیے۔ پرچہ کا خیال نہ کیجئے۔ پہلے کچھ ناشتہ
کر لیجئے، بعد میں پرچہ بھی ہوتا رہے گا۔ میں نے انکار کیا۔ وہ زبردستی
مجھ کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی میز کے پاس لے گئے۔ وہاں قریب ہی
ایک چھوٹی میز پر چائے وغیرہ رکھی ہوئی تھی، مجھ سے کہا آپ اچھی
طرح ناشتہ کر لیجئے۔ خالی پیٹ ہے پرچہ کیا خاک سمجھ میں آئے گا۔
میں نے شکریہ ادا کیا اور چائے پینے لگا۔ انھوں نے باتوں ہی
باتوں میں تمام حالات پوچھ لئے۔ اور کہنے لگے تمھاری والدہ اور بہن کا
کیا حال ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ سلائی کے آج کچھ پیسے آنے والے ہیں
خدا دن گزار دے گا۔ انھوں نے کہا اور اگر آج پیسے نہ آئے تو میں
نے کہا ایسی حالتیں ہم غریبوں پر اکثر گزرتی ہیں۔ بہرحال چائے کی
پیالی پی کر میرے اوسان درست ہوئے۔ انھوں نے اصرار کر کے دو چار
بسکٹ بھی کھلائے اور کہا اب آپ اپنی جگہ پر بیٹھ کر گھبرائیے نہیں
پرچہ آسان ہے۔ پرچہ سے غرض رکھئے۔ گذشتہ اور آئندہ واقعات
کو دل میں نہ لائیے۔ انشاء اللہ آپ کامیاب ہوں گے اور ضرور
کامیاب ہوں گے۔ پرچہ کے بعد دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے
میں یہ بھی دیکھوں گا کہ آپ نے پرچہ کیسا لکھا۔ میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا
پرچہ دیکھا تو واقعی آسان تھا۔ میرے محسن تھوڑی تھوڑی دیر کے
بعد میرے پاس آتے اور کہتے۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ خدا مسبب الاسباب

انھوں نے واقعات پوچھے۔ میں نے بے کم و کاست بیان کر دیئے۔ وہ یہ سنتے
ہی سجدہ میں گر پڑیں اور بڑی دیر تک رو رو کر چپکے چپکے دعائیں مانگتی رہیں۔
سجدہ سے سر اٹھا کر انھوں نے جا نماز کے نیچے سے ایک خط نکالا اور کہنے لگیں
"پڑھو یہ بھی وہی فرشتہ رحمت ہے" میں نے خط دیکھا۔ لکھا تھا۔ جناب
بیگم صاحبہ تسلیم۔ افسوس ہے آج کل ہم لوگ ہاتھی ہیں کچھ ایسے گرفتار
ہو گئے ہیں کہ اپنے غریب اور شریف بھائی بہنوں کی خبر رکھنا اور لینا بے
ضرورت سمجھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے
بعد اگر اپنے مقدور کے موافق میں آپ کی امداد نہ کروں تو باری تعالیٰ کو کیا
جواب دے سکوں گا۔ یہ معلوم کر کے کہ بٹیا رضیہ سلمہا کے زیور کس طرح
اور کہاں گروی پڑے ہیں۔ اگر بیٹی کے پاس زیور نہیں تو کس منہ
سے میں اس غریب تو آنحضرت رسالتمآب کے سامنے جاؤں گا۔ جو کچھ
اس وقت مجھ سے ہو سکا وہ نذر کرتا ہوں۔ قرض حسنہ سمجھ کر قبول فرمائیے
ماشاء اللہ آپ کا بچہ بہت ہوشیار ہے۔ وہ ادا کر دے گا اور اگر
نہ ادا کیا تو میں اسے معاف کرتا ہوں لیکن آپ خدا کے لئے رضیہ کا دل
نہ توڑیے۔ اس کا زیور منگوا دیجئے۔ کیونکہ جب سے کان میں یہ سن لیا
کہ اس کا زیور رل گیا۔ مجھے چین نہ آئے گا۔ دعا کیجئے کہ خداوند تعالیٰ
مجھ کو اپنے غریب بھائی بہنوں کی مدد کی توفیق عنایت فرمائیے۔"
خط کے ساتھ سو روپے کے نوٹ تھے۔ زبان فرمانے لگیں کہ آج
عید کے قریب ایک چپراسی آیا تھا۔ یہ دے کر اور یہ کہہ کر چلا گیا
کہ بیگم صاحبہ کا خط ہے۔ ابھی کھول کر اس کو پڑھ لیں۔ مضمون سے تو
سمجھ میں آتا تھا کہ میرے نام کا ہے۔ لیکن سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تھا کہ یہ

کون اللہ کا نیک بندہ ہے۔ چلو تمھارے بتانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا۔
میں نے کہا اماں اس طرح روپیہ لینا ٹھیک نہیں۔ بہتر ہو گا کہ کل میں
لے جا کر واپس کر دوں۔ والدہ صاحبہ نے کہا کہ نہیں بیٹا۔ ہرگز نہیں
اس طرح روپیہ واپس کرنے سے اُن کی توہین ہوگی۔ تم اُن کا شکریہ
ادا کر دو اور یہ کہہ دو کہ "بھائی یہ تمھارا قرض ہے" خدا تمھیں جزائے
خیر دے، تم نے ہم بے وارثوں کا وقت پر ہاتھ پکڑا۔ ہم اور ہماری
اولاد ہمیشہ تمھارے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہوں گے۔
اور اُن سے یہ بھی کہہ دینا کہ بھائی ہم کیا اور ہماری دعا کیا۔ لیکن اس
دکھیا رے دل سے مرتے دم تک جو دعا نکلے گی وہ تمھارے اور تمھارے
بال بچوں کے لیے نکلے گی۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر فرمانے لگیں بیٹا۔
جا چنی لال کو روپیہ دے کر رضیہ کا زیور لے آ۔ اس معصوم کے دل سے
خوش ہو کر دعا نکلے گی تو انشاء اللہ ہمارے محسن کا دین و دنیا دونوں
میں بھلا ہو گا۔ میں چنی لال سے دونوں چیزیں چھڑا کر لایا۔ والدہ
صاحبہ نے رضیہ کو پہنایا۔ وہ ایسی خوش ہوئی کہ کیا بیان کروں کہنے
لگی۔ کیا بھائی جان پاس ہو گئے؟ اماں نے کہا انشاء اللہ اب پاس
ہو جائیں گے۔ بیٹیا تم دعا مانگو جس نے تمھیں یہ چیزیں واپس دلوائیں
خدا اس کو دونوں جہان میں جزائے خیر دے۔ غرض اماں کہتی جاتی
تھیں اور رضیہ دعائیں مانگتی جاتی تھی۔ اس عرصہ میں مغرب کا وقت
ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے
تو دن کے تمام واقعات یاد آ گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری
ہو گئے۔ زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اماں نے جو میری یہ حالت دیکھی

فرمانے لگیں "ہاں بیٹا۔ یہی دعا کا وقت ہے۔ اپنے اور میرے لئے
کچھ نہیں اپنے محسن کے لئے دعا کرو خدا قبول کرے گا" بہرحال نماز سے
فارغ ہو کر میں کتاب دیکھنے لگا اور کوئی بارہ بجے سو گیا۔ صبح اٹھ کر
پھر امتحان میں گیا۔ دروازہ ہی پر نگراں کار صاحب ملے۔ میں ان سے
کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انھوں نے مجھے روک دیا اور کہا "میاں صاحبزادے
اب میں تمھارا مہاجن ہوں، تم کو جب ضرورت ہو مجھ سے بے تکلف
لے جانا۔ مگر یاد رکھنا کہ تم سے یہ رقم مارواڑیوں سے زیادہ سختی سے
وصول کروں گا"

کھانے کے وقت پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ساتھ ہی
کھلایا۔ میں نے جو کچھ والدہ صاحبہ نے کہا تھا اُن سے عرض کیا۔ کہنے
لگے۔ میاں اس ماں کی قدر کرو جو مصیبتیں اٹھا اٹھا کر تم کو پال
رہی ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ آئندہ یہ تمام واقعات بھول جاؤ اور بیوی
کے سامنے ماں کو کونے میں بٹھا دو۔ غرض اسی طرح وہ مجھے نصیحتیں
کرتے رہے۔ آج کے پرچے بھی میرے بہت اچھے گئے اور خدا خدا
کر کے امتحان ختم ہوا۔ اب نتیجے کے انتظار میں ایک ایک دن کاٹنا مشکل
ہو گیا۔ آخر ایک دن معلوم ہوا کہ سنیچر کے دو بجے نتیجہ شائع ہو گا۔ میں
بھی بحالت امید و بیم پہنچا۔ دیکھا کہ نوٹس بورڈ پر نتیجہ لگا ہوا ہے اور
سامنے سیکڑوں امیدوار کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی گھس گھسا کر
نتیجہ دیکھنا شروع کیا۔ لیکن میرے نام کا کہیں پتہ نہیں۔ کئی دفعہ دیکھا
لیکن نام کا پتہ نہ چلا۔ آخر مایوسی کی حالت میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
اتنے میں کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا پھر کر دیکھوں تو وہی میرا

فرشتۂ رحمت ہنس کر کہنے لگے۔ "تم پاس ہو گئے"۔ میں نے کہا نہیں
ممتحنوں نے نوٹس بورڈ پر جا کر دیکھا اور میرے پاس آ کر کہنے لگے "ارے
میاں تمہارا نام تو سب سے اول تھا کسی دل جلے نے اوپر کا حصہ
پھاڑ دیا ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رجسٹرار صاحب
کے پاس لے گئے اور اصل رجسٹر میرے سامنے رکھ کر کہا کہ لو دیکھ لو
اور اطمینان کر لو۔ مگر میاں ہم مٹھائی ضرور کھائیں گے یہ نہ ہو کہ پاس
ہونے کے بعد ہم کو سوکھا ہی ٹال دو۔ رجسٹرار صاحب نے بھی مبارکباد
دی اور میرے پرچوں کی بہت تعریف کرتے رہے۔ اسی میں خوشی
خوشی گھر پہنچا۔ والدہ صاحبہ سے جا کر کہا۔ وہ بڑی دیر تک مجھے گلے
سے لگا کر روتی رہیں۔ کھانا کھاتے میں کسی نے آ کر کہا کہ ایک زنانی گاڑی دروازہ
پر کھڑی ہے۔ باہر جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے محسن کی بیوی میری والدہ
کو مبارکباد دینے آئی ہیں۔ خیر ان کو اتروا کر میں تو باہر چلا گیا۔ وہ ایک گھنٹہ
کے بعد واپس آیا تو معلوم ہوا وہ تشریف لے گئیں اور میری والدہ
سے کہہ گئیں کہ کل آپ کی اور آپ کے صاحبزادے اور صاحبزادی کی
میرے یہاں دعوت ہے۔ گاڑی آئے گی آپ ضرور آئیے۔ دوسرے روز
سہ پہر کو گاڑی آئی اور ہم لوگ سوار ہو کر وہاں پہنچے جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ
بہت سی گاڑیاں اور موٹریں دروازہ پر کھڑی ہیں اور ایک بڑے اٹ ہوم
کا انتظام ہے۔ شہر کے اکثر عہدے دار اور بڑے بڑے وکیل جمع ہیں۔
میرے محسن نے میرا تعارف سب سے کرایا۔ ہر ایک سے یہی کہتے تھے
کہ میرے ایک مرحوم عزیز دوست کا لڑکا ہے۔ تھوڑی دیر باتیں ہونے کے
بعد سب لوگ میز پر آ گئے اور بہت خوشی وقت گزر گیا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد میرے

محسن نے کہا "محبو" اسٹیج ہوم" میں کسی اسپیچ دینے کا دستور ہے لیکن خاص
حالات کی وجہ سے میں اس طریقے کے خلاف کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں دعوت کے کارڈ
گو میری طرف سے تقسیم ہوئے ہیں لیکن اصل داعی اس دعوت کے (میری طرف اشارہ
کرکے) یہ ہیں۔ انہوں نے صرف اس خیال سے کہ آپ صاحبوں سے ان کی ملاقات
نہیں تھی یہ ذمہ داری میرے سر رکھی اور میں نے اس خیال سے اس کو قبول کیا کہ میں خود
آپ لوگوں سے میں ان کا تعارف کرا سکوں گا۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ اس
سال کے امتحان وکالت میں یہ سب سے اول رہے ہیں اور اس بات کا میں آپ کو
یقین دلاتا ہوں کہ نہایت شریف محنتی ایماندار اور تجربہ کار شخص ہیں اور مجھے یقین
کامل ہے کہ ابتدائے وکالت میں اگر میرے عزیز دوستوں میں سے کسی نے ان کو اپنے
ساتھ لے لیا اور آپ صاحبوں نے ان کی بہبودی اور رعایت کا خیال پیش
نظر رکھا تو یہ ایک ہوشیار اور کامیاب وکیل ثابت ہوں گے۔ کیا میرے عزیز
دوستوں میں سے کوئی میری استدعا کو قبول فرمائیں گے؟" اس اسپیچ کے
ختم ہوتے ہی شہر کے سب سے ممتاز وکیل یعنی مولوی ذوالفقار صاحب
اٹھے اور کہا "میرے عزیز فیاض دوست نے اس نوجوان دوست کے
تمام واقعات مجھ سے بیان کر دیئے ہیں۔ میں اپنے اس نوجوان دوست کی مدد
کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں اور نہایت خوشی سے اپنے ساتھ وکالت
میں شریک کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ میں ان سے یہ ضرور درخواست کروں گا
کہ اپنے تمام واقعات بے کم و کاست چھپوا دیں تاکہ ہم لوگوں کو جو دوسرے کا منہ
تکا کرتے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اکثر بھائی اور بہنیں کس مصیبت میں
ہیں اور کس طرح غریب لیاقت ہمارے جواہر پاروں کو خاک میں ملا دیتی ہے
اور کس طرح ہم لوگ اپنی ہمدردی کے فرض کو بھول کر دیئے کو بے محل [illegible]

اور خرافات میں تباہ کر رہے ہیں۔" اس کے بعد میں نے کھڑے ہو کر
بہت مختصر الفاظ میں وکیل صاحب کا شکریہ
ادا کیا اور اپنے واقعات کو طبع کرانے کا وعدہ کیا
اپنے محسن سے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے،
میرا گلا بند ہو گیا اور میں ایک لفظ نہ بول سکا۔ یہ دیکھ کر وہ خود اٹھے،
مجھے گلے سے لگایا اور کہا میاں صاحبزادہ میری تعریف کرنے کی ضرورت
نہیں اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کبھی اپنے کسی بھائی کی بروقت مدد کی
تو میں سمجھ لوں گا کہ احسان کا بدلہ احسان سے ہو گیا۔ جاؤ اب محنت کرو
عدالت کا ادب کرو، اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے مل جل کر کام کرو، اپنے
موکلین کی دلجوئی کرو۔ سچ پر قائم رہو۔ خدا تم کو کامیاب کرے گا۔ اس
دعوت میں جو وعدہ میں نے کیا تھا۔ اس کی تعمیل میں میں نے یہ اپنے
حالات لکھے ہیں خدا کرے ان کے پڑھنے سے دوسرے سبق حاصل کریں
اور ہم لوگوں میں وہ اسپرٹ پیدا ہو جائے جو میرے محسن میں کوٹ کوٹ
کر بھری ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری وکالت بہت اچھی چل رہی ہے
مگر آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ جب امتحان کا خیال آتا ہے تو میرا دل لرز
جاتا ہے۔